اپریل ۱۹۶۴ء

مُدیرِ اعلیٰ :- نیاز فتحپوری

نگار پاکستان

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

سالانہ چندہ
دس روپے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۴۷۲
ٹیلیفون نمبر ۴۳۶۹۳

اپریل ۱۹۶۴ء

نگارِ پاکستان

مدیر اعلیٰ
نیاز فتحپوری
نائب مدیران
فرمان فتحپوری — عارف نیازی

زرِ سالانہ دس روپے، فی پرچہ پچھتر پیسے

نگارِ پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی نمبر ۳،

منظور شدہ برائے مدارس کراچی۔ بموجب سرکلر نمبر ڈی۔ ایف۔ یو۔ پی۔ بی ۳۶۶۹۔ ۶۸۔ محکمہ تعلیم کراچی

کتابت عالم علیگ

پرنٹر پبلشر۔ عارف نیازی نے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ سے شائع کیا۔

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

"خدا نمبر"

شایع ہو گیا

خدا کیا ہے ؟ خدا کا تصوّر کب اور کیسے پیدا ہوا ؟ مختلف مذاہب نے اس تصور میں کس طرح جنم لیا ؟ اس کی ارتقائی صورتوں نے تمدن انسانی پر کیا اثر ڈالا ؟ بندے اور خدا کا تعلق کیا ہے ؟ اس تعلق کی تعبیر کس کس انداز میں کی گئی ہے - انبیاء کرام، مصلحین اور مجددین کے ارشادات اس کے متعلق کیا ہیں ؟ ان ارشادات کو اقوام عالم نے کس طرح اپنایا ہے ؟ اسلام کا موقف اس باب میں کیا رہا ہے، اور اس موقف کو مذاہب عالم سے کیوں برتر خیال کیا گیا ہے ؟

یہ اور اس قسم کے بہت سے اہم سوالات

ہیں جو خدا اور مذہب کا نام آتے ہی ہر باشعور انسان کے ذہن میں اُبھرتے ہیں ۔ لیکن افسوس کہ اُردو میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جو اہل فکر و دانش کی پیاس اس سلسلے میں بجھا سکے - نگار کا "خدا نمبر" اس نوع کا پہلا صحیفہ ہے - جس میں مذکورہ سوالات کا نہایت مدلل و مشرح جواب دیا گیا ہے -

اپنے قریبی بُک اسٹال سے طلب کریں !

قیمت ــــــــ چار روپے (۴/۰/۰)

نگار پاکستان ۱۹۶۴ء کا سالنامہ

تذکروں کا تذکرہ نمبر

مئی سنہ ۱۹۶۴ء میں شائع کیا جارہا ہے!

جو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں پہلی بار انکشاف کریگا کہ

تذکرہ نگاری کا فن کیا ہے

۱. تذکرہ نگاری کی روایات و خصوصیات کیا رہی ہیں؟

۲. اس کی امتیازی روایات کب اور کن حالات میں ہوا؟

۳. تذکرہ نگاری کا رواج کب اور کن حالات میں ہوا؟

۴. اردو فارسی میں آج تک کتنے تذکرے لکھے گئے ہیں؟

۵. ان تذکروں اور مصنفین کی کیا نوعیت ہے؟

۶. ان میں کتنے اور کن کن شاعروں کا ذکر آیا ہے؟

۷. ان میں کسی خاص عہد کی ادبی و سماجی فضا کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے؟

۸. ان تذکروں میں اردو فارسی زبان و ادب کا کتنا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے؟

۹. یہ خزانہ ادب کے تاریخی، تحقیقی، سوانحی اور تنقیدی شعبوں کے لئے کس درجہ مفید اور کتنا اہم ہے؟

ضخامت ...... تقریباً ۳۰۰ صفحات

قیمت ...... چار روپے

آئندہ شمارہ سالنامہ ۱۹۶۴ء تذکروں کا تذکرہ نمبر
(مئی وجون کا مشترک شمارہ) مئی کے پہلے ہفتہ میں شائع کیا جارہا ہے

اپریل ۱۹۶۴ء
ماہنامہ نگار پاکستان
کراچی

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگیا

فہرست

۴۳ واں سال	فہرست مضامین اپریل ۱۹۶۴ء	شمارہ (۴)

ملاحظات ...... عشوہ ہائے سیاسیات ...... نیاز فتحپوری ۵
ناسخ ...... ایک مطالعہ ...... فراق گورکھپوری ۱۱
ایک پروفیسر اقتصادیات کی شاعر بیوی ...... مزاحیہ ڈرامہ ...... نیاز فتحپوری ۱۷
لالۂ صحرائی ...... احمر رفاعی ۲۲
دنیائے عیسویت کا ایک پرعظمت وجلال باغی ...... والٹیر ...... نیاز فتحپوری ۳۴
میر درد کی ایک خصوصیت ...... امجد کندیانی ۴۶
طنزیات فارسی کے بعض نوادر ...... نیاز فتحپوری ۵۰
عہد مغلیہ کا عسکری ومالی نظام ...... نیاز فتحپوری ۵۲
قربانی کی شرعی حیثیت ...... رفیع اللہ ۵۹
عہد حاضر کی ایک مہذب ترین قوم ...... نیاز فتحپوری ۶۴
باب الانتقاد ...... محمد انصار اللہ نظر ۶۶
باب المراسلہ ...... ایک مولویانہ احتجاج ...... نیاز فتحپوری ۷۲
باب الاستفسار ...... (۱) بطے (۲) لکم دینکم ولی دین (۳) سب سے پہلی اور آخری آیات کلام اللہ ...... نیاز فتحپوری ۷۴
منظومات ...... سید شفقت کاظمی - منظر صدیقی اکبرآبادی، سعادت نظیر، تابش شجاع آبادی ۷۸

ملاحظات

عشوہ ہائے سیاست

نیاز فتحپوری

اس وقت دنیا جس دور سے گزر رہی ہے اس کے سمجھنے کے لئے، ہمیں ایک ایسے مریض کو سامنے رکھنا چاہئے جو تپ محرقہ میں مبتلا ہے اور جتنی کوشش تدبیر علاج میں صرف کی جاتی ہے، اُتنا ہی زیادہ اس کا ہذیان و بحران بڑھتا جا رہا ہے۔

پھر یوں تو نہ معالجوں کی کمی ہے نہ تیمارداروں کی، دوائیں بھی تجویز ہو رہی ہیں، خارجی تدبیریں بھی جاری ہیں لیکن مریض موت و حیات کے درمیان نہایت نازک حالات سے گزر رہا ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کس وقت اس کی سانس اُکھڑ جائے۔ صحت کی کوئی اُمید باقی نہیں اور موت ہے کہ آ نہیں چکتی۔

اس مرض کی تاریخ بہت قدیم ہے اور اس کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب نوع انسانی کے افراد ایک دوسرے سے صرف اس لئے نفرت کرنے لگے کہ ایک ہی چیز کو کوئی کسی نام سے پکارتا تھا اور کوئی دوسرے نام سے۔ یعنی جھگڑا آگ، پانی کے امتیاز کا نہ تھا بلکہ محض اس بات کا کہ جس چیز کو ایک شخص اگنی کہتا ہے اسے دوسرا آگ کیوں کہتا ہے۔

آہستہ آہستہ اس مرض نے کتنی ترقی کی، اس کا حال معلوم کرنا ہو تو مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے اور اگر ریاضی کے اعداد و شمار آپ کا ساتھ دیں تو معلوم کیجئے کہ اس نے خدا کی کتنی آبادی کا خون بہایا، کتنے افراد کو زندہ جلا دیا، اور کتنی عورتوں اور معصوم بچوں کے گلوں پر چھری چلائی۔

پھر یقیناً یہ مرض کوئی معمولی مرض نہ تھا لیکن اتفاق سے چند چارہ ساز پیدا ہو گئے اور انہوں نے نوع انسانی کو فوری خطرۂ ہلاکت سے بچا لیا۔ تاہم اس کا کلی ازالہ نہ ہو سکا اور بعض قوموں میں اس زخم نے ناسور کی سی صورت اختیار کر لی۔

ابھی یہ بیماری دور نہ ہوئی تھی کہ دنیا دوسرے مرض میں مبتلا ہو گئی جس کا نام ملوکیت و استبداد تھا۔ پہلا مرض خدا کا پیدا کیا ہوا تھا یا نہیں، لیکن یہ دوسرا مرض تو یقیناً خود انسان ہی نے دنیا پر مسلط کیا۔ پہلے خدا کے نام پر خون بہایا جاتا تھا اور اب عیش و تنعم کے لئے بہایا جاتا ہے۔ پہلے غریبوں کے خون سے علماء مذہب کا غازۂ مقدس طیار ہوتا تھا اور اب سلاطین و امراء کی قبائیں اس سے رنگی جانے لگیں، پہلے اس کے چھاپے معابد و کنائس کی دیواروں پر لگائے جاتے تھے اور اب سرمایہ دار اس سے ہولی کھیلی جاتی ہے۔

اس دور میں جو جو مظالم انسانیت کی جان پر توڑے گئے، ان کی تفصیل معلوم کرنا ہو تو شاہان سلطنت کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے، سلطنتوں کے

عروج وزوال کی داستانیں پڑھیے، اُن جابرۂ اُمم کی سیرت کا مطالعہ کیجیے، جن کی زندگی کا تنہا مشغلہ تلوار کی نوک سے صرف دنیا کا جغرافیہ بدل دینا تھا۔ صدیاں آئیں اور اسی طرح گزر گئیں؛ قرن پر قرن آئے اور اسی انداز سے ختم ہوتے رہے۔ غریبوں کا خون برابر اسی طرح بہتا رہا اور ظلم کی کھیتیاں بدستور اس سے سینچی جاتی رہیں۔ یہاں تک کہ انسانیت نے پھر ایک مضطربانہ کروٹ لی اور بہت سے تخت و تاج اُلٹ گئے۔

خیال تھا کہ اب دنیا شاید زیادہ اطمینان کی سانسیں لے سکے گی، لیکن افسوس ہے کہ یہ اُمید بھی خاک میں مل گئی۔ یعنی جب مذہب و ملوکیت کی تلواریں کند پڑ گئیں تو سرمایہ داری کے "دشنۂ پنہاں" نے اس کی جگہ لے لی۔ یعنی اگر پہلے گلے پر تلوار پھیر کر ایک ہی دفعہ سارا خون نچوڑ لیا جاتا تھا تو اب بچوکے دے دے کر آہستہ آہستہ حاصل کیا جانے لگا۔ پہلے دشمن کو دشمن کہہ کر ذبح کیا جاتا تھا اور اب اسے دوست کہہ کر ہلاک کیا جاتا ہے۔ پہلے تیغ و تفنگ کی قوت سے انسان کو روندا جاتا تھا تو اب علم و ذہانت سے پامال کیا جانے لگا۔ پہلے ملک گیری اگر ملوکیت کے نام سے کی جاتی تھی تو اب تہذیب و شائستگی پھیلانے کے لئے۔ پہلے اگر سینہ پر چڑھ کر بہ جبر زہر پلایا جاتا تھا تو اب شیرینی میں ملا کر دیا جانے لگا۔ وہ زہر اگر حلق سے اُترتے ہی کام تمام کر دیتا تھا تو یہ آہستہ آہستہ گھلا گھلا کر جان لینے لگا۔ الغرض دنیا جس مرض میں مبتلا تھی اس کی نوعیت تو بیشک بدل گئی لیکن اس سے چھٹکارا نصیب نہ ہوا۔ پھر مایوسی اس لئے نہیں ہے کہ معالج کوئی نہیں، بلکہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ معالج متعدد پیدا ہو گئے ہیں اور ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہیں ہو سکا کہ ان میں علاج کا اولین حق کسے حاصل ہے۔

ایک طرف سیطرت (Suzerainty) تھی جو اپنے آپ کو سب سے زیادہ خیرخواہ عالم قرار دیتی تھی، دوسری طرف آمریت (Dictatorship) جو اپنے آپ کو قیام امن و سکون کا سب سے بڑا حامی کہتی تھی۔ کہ اسی دوران میں اشتراکیت (Socialism) نے اپنے چہرے سے نقاب اُٹھایا اور اس کے مظاہرہ حسن و جمال سے لوگ مسحور ہو گئے لیکن جب اس سے واسطہ پڑا تو معلوم ہوا کہ اس کے شرائط وصل بھی آسان نہیں۔

جس وقت گزشتہ جنگ عظیم ختم ہوئی اور معاہدہ ورسیلز (Versailles) مرتب ہوا تو دنیا خوشی سے اُچھل پڑی، گویا دنیا کا دورِ زریں جرمنی کی شکست و پامالی ہی کا منتظر تھا۔ فاتح قومیں خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں اور اپنی اخلاقی بلندی کا یقین دلانے کے لئے کہہ رہی تھیں کہ جنگ ہر چند بری چیز ہے، لیکن اس کو ختم کرنے کے لئے دوسری جنگ چھیڑنے کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ پھر جنگ تو بیشک ختم ہو گئی اور امن و سکون کا زمانہ بھی آ گیا۔ لیکن صورت حال بالکل وہی ہے، یعنی پہلے اگر جنگ نے جنگ کو ختم کیا تھا تو اب یہ امن و سکون، امن و سکون کو ختم کر کے رہے گا۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب پانی میں جال ڈالا جاتا ہے تو وہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہوتا ہے، لیکن جب آہستہ آہستہ اس کی ڈوریاں کھینچی جاتی ہیں تو وہ رفتہ رفتہ تنگ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ دفعتاً اس کے کنارے مل جاتے ہیں اور مچھلیوں کے باہر نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی ــــ بالکل یہی حالت اس وقت سیاسیات عالم کی ہے۔ کہ ایک طرف امن و سکون کی بھی پکار ہے اور دوسری طرف جال کی ڈوریاں بھی آہستہ آہستہ کھنچ رہی ہیں ــــ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی دولت کو صلح و آشتی کی حمایت میں صرف ہونا چاہیئے اور دوسری طرف دنیا کی نصف سے زیادہ دولت جنگ کی طیاریوں میں صرف ہو رہی ہے ــــ الغرض

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اور ایک نہ ایک دن دنیا کو انہیں پر قربان ہونا ہے!

حکومتِ پاکستان | ایک صاحب نے جو پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں مجھے لکھا کہ "جب تک نگار ہندوستان سے نکلتا رہا اس نے ہمیشہ بڑی آزادی

بباکی سے وہاں کی حکومت و سیاست پر نکتہ چینیاں کیں، لیکن یہاں آجانے کے بعد اس نے پاکستان کی حکومت و سیاست پر اس وقت تک کوئی رے زنی نہیں کی، اس کا سبب کیا ہے"۔ — چونکہ یہ سوال پبلک حیثیت رکھتا ہے، اس لئے اس کا جواب بھی مجھے اسی حیثیت سے دینا چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت گزر چکی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ میں نے یہ زمانہ یہاں آنکھ بند کر کے نہیں ارا، تاہم پاکستان کے تمام اندرونی و بیرونی مسائل سمجھنے کے لئے جتنی فرصت کی ضرورت ہے وہ ہنوز مجھے حاصل نہیں ہوئی۔ اور اسی لئے میں اس وقت ے اس موضوع پر گفتگو کرنے سے محترز رہا۔

جس حد تک سرسری مطالعہ کا تعلق ہے، میں کیا ہر شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ حصول آزادی کے بعد پندرہ سال کے اندر پاکستان نے اپنی حالت سنبھالنے کے لئے جو کچھ کیا وہ یقیناً بڑا مجاہدانہ اقدام تھا، اور کچھ اسی انداز کا تھا جیسا چین کی قومی حکومت ختم ہونے کے بعد کمیونسٹ چین نے اختیار کیا۔

تقسیم ہند کے بعد، جدید حالات کا مقابلہ بھارت اور پاکستان دونوں کو کرنا تھا اور کیا گیا، لیکن ان کی نوعیت میں بڑا فرق تھا۔ بھارت تو تقسیم کے بعد بھی وہی رہا جو پہلے تھا یعنی جو اقتصادی، صنعتی و تجارتی ترقیاں اسے پہلے حاصل تھیں وہ بدستور اسی کے ہاتھ رہیں، لیکن پاکستان کو تو اپنا گھر از سرِ نو خود پنے ہاتھ سے بنانا تھا۔ یعنی اگر وہاں سوال صرف بقاءِ عیش و تنعم کا تھا تو یہاں بقاءِ حیات کا ۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کی حیثیت enough and to spare (کھاؤ اور بچا بھی لو) کی تھی، لیکن پاکستان "چہ خورد ماہداد فرزندم" کی فکر میں مبتلا تھا۔ اردو کی مشہور مثل ہے "ننگی کیا نہائے ور کیا نچوڑے" بالکل یہی حالت پاکستان کی تھی گویا اس کی زندگی ان خیمہ نشین صحرائیوں کی سی تھی جن کو خود ہی زمین کھودنا تھی اور خود ہی پانی نکالنا۔ ور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے یہی کیا اور بڑی پامردی سے کیا، یہاں تک کہ چند سال کی قلیل مدت میں اس نے اپنی محنت و فراست یا محض خدا کی عنایت سے ہوا کا رخ بدل دیا اور آج وہ کون سے علائم نہضت و ترقی ایسے ہیں جن کا نشان ہم کو یہاں نہیں ملتا اور بلند معیار زندگی کے وہ کون سے مظاہر ایسے ہیں جو یہاں نظر نہیں آتے۔ حالانکہ پاکستان کا ابتدائی دورِ حکومت بدقسمتی سے بڑا غیر متیقن و متزلزل رہا، ورنہ اس وقت پاکستان کا اقتصادی موقف یقیناً بڑا قابلِ رشک ہوتا۔

ایک اور بات جس نے پاکستان کو زیادہ ابھرنے نہ دیا، وہ نزاعِ کشمیر کا مسئلہ تھا جو اب تک نہیں سلجھ سکا اور جس پر پاکستان کو اپنی ملکی دولت کا بڑا حصہ صرف کرنا پڑ رہا ہے۔

مسئلۂ کشمیر

کشمیر کا ذکر آگیا ہے تو اس کی داستان بھی سن لیجئے۔ اس باب میں جو اختلاف مابین بھارت و پاکستان پایا جاتا ہے اس وقت اس کی تاریخ بیان کرنا ضروری نہیں، نہ یہ کہ باوجود مسلم اکثریت ہونے کے وہ کیوں پاکستان کو نہیں ملا اور اس کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کے لئے بھارت نے کیا کیا تدابیر اختیار کیں، بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ نزاع کسی وقت ختم ہو سکتی ہے یا نہیں اور اگر ہو سکتی ہے تو اس کی نوعیت کیا ہوگی۔ میں کشمیر اور حیدرآباد یا جوناگڑھ کو ایک ہی صف میں نہیں رکھتا، کیونکہ اگر ان ریاستوں کو آزاد کر دیا جاتا یا پاکستان سے ملحق کر دیا جاتا تو بھی یہ بات بے معنی سی ہوتی، کیونکہ وہاں کی ہندو اکثریت کبھی ان کو چین سے نہ بیٹھنے دیتی اور رات دن خونریزی ہوتی رہتی۔ پاکستان زیادہ سے زیادہ صرف ان کی اخلاقی مدد کر سکتا تھا جو بالکل بے نتیجہ سی بات ہے۔ لیکن کشمیر کا مسئلہ بالکل مختلف ہے کیونکہ وہاں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے اور اصول و جذبات دونوں حیثیتوں سے انہیں پاکستان ہی سے متعلق ہونا چاہئے تھا۔ پھر یہ داستان بڑی تلخ ہے کہ اول اول جب قبائلی یا سرحدی افواج نے کشمیر پر تاخت شروع کی اور کافی آگے بڑھ گئیں تو پھر یہ اقدام کیوں رک گیا اور کیوں بھارت کی افواج کو یہاں آنے کی فرصت دی گئی۔ اس کے متعلق مختلف بیانات سننے میں آئے ہیں۔ بہرحال سبب جو کچھ بھی رہا ہے اس سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستان نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا یا نہ اٹھا سکا۔ اور بات سیکیورٹی کونسل تک پہونچکر کھٹائی میں پڑ گئی۔ خیر یہ تو گزری ہوئی باتیں ہیں جن کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ صورت حال اس مسئلہ کی کیا ہے۔

بھارت اپنی جگہ بالکل مختتم طور پر طے کر چکا ہے کہ وہ وادیٔ کشمیر کو ہاتھ سے نہ جانے دیگا' اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ ہر تب ادنی گردہ والی ترکیب پر عمل کرے' آزاد کشمیر کا بھی مدعی بن بیٹھا' تاکہ پاکستان اس اندیشہ سے کہ مبادا آزاد کشمیر بھی ہاتھ سے نکل جائے' موجودہ موقف پر راضی ہو جائے۔ چنانچہ تین چار سال قبل کی بات ہے کہ اخباروں میں "Status quo" کی باتیں شروع بھی ہو گئی تھیں' یعنی یہ کہ تقسیم کشمیر کی جو موجودہ صورت ہے اسی پر پاکستان و ہندوستان متفق ہو کر آیندہ کے لئے اس جھگڑے کو ختم کر دیں' لیکن یہ بات آگے بڑھی نہیں' اور غالباً اس وجہ سے کہ یہ صورت پاکستان کے لئے ناقابلِ قبول تھی۔

اسی سلسلہ میں ہندوستان ایک تدبیر اور بھی پہلے ہی عمل میں لا چکا تھا۔ یعنی اس نے چند مخصوص افراد کو کشمیری عوام کا نمائندہ قرار دیکر وہاں ایک جمہوری حکومت کا سارنگ پیدا کر دیا اور اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ اگر کسی وقت نمایندگیٔ عوام کا سوال پیش آئے تو وہ کہہ سکے کہ کشمیر کی حکومت تو دراصل عوام کی ہی حکومت ہے اور عوام ہی کے نمائندے اسے چلا رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ اور حکومت کا سررشتہ تھا دراصل بھارت کے ہاتھ میں جہاں سے کشمیری کابینہ کی کٹھ پتلیوں کو حرکت دی جاتی تھی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ شیخ عبداللہ کو نظر بند کر دیا گیا جو واقعی کشمیریوں کا نمایندہ تھا اور اسے اب تک رہا نہیں کیا گیا۔

اس دوران میں پاکستان برابر احتجاج کرتا رہا کہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ جمہوریت کی ظاہری نمود و نمائش کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن بھارت نے پاکستان کے اس احتجاج کو کبھی اہمیت نہیں دی' اور ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ کشمیر کا سوال صرف اس وقت طے ہو سکتا ہے جب خود کشمیری عوام میں جذبۂ بیداری پیدا ہو' محض پاکستان کے کہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ الغرض یہ حالت منتظرہ بدستور اسی طرح قائم رہی کہ دفعتاً اس دوران میں موئے مبارک کا واقعہ پیش آ گیا جس نے کشمیریوں کے جذبات میں مذہبی ہیجان پیدا کر دیا اور چند قربانیوں کے بعد ایک جماعت وہاں ایسی پیدا ہو گئی جس نے آزادانہ رائے طلبی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اور اسی کے پیشِ نظر پاکستان کو بھی موقع مل گیا کہ وہ پھر سکیورٹی کونسل کو اس طرف متوجہ کرے۔ چنانچہ اس وقت یہ مسئلہ وہیں زیر بحث ہے' اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔

چین و بھارت

ایشیائی ممالک میں چین و ہندوستان کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اب سے چند سال قبل ان دونوں ملکوں کے سیاسی تعلقات بہت ہموار تھے' لیکن اس دوران میں سرحدی نزاع نے اختلاف کی صورت اختیار کر لی اور چین نے (جیسا کہ اس کا بیان ہے) اپنی چند سرحدی چوکیاں واپس لینے کے لئے فوجی اقدام شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھارت کی فوجی ساکھ ختم ہو گئی اور امریکہ نے یہ سمجھ کر کہ مبادا کسی وقت چین کی اشتراکی تحریک ایشیا میں زیادہ وسعت اختیار کر لے' اس نے اندھادھند بھارت کو فوجی امداد دینا شروع کر دی اور بھارت نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے چین کو ایشیا کے مستقبل کا بڑا اہم خطرہ قرار دیدیا۔ پھر اس کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ بھارت نے امریکہ سے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو معمولی حالات میں اسے حاصل نہ ہو سکتا تھا' لیکن اسی کے ساتھ سچ پوچھئے تو اس نے اپنے گدایانہ روش سے اپنے اقتدار کو بھی ہاتھ سے کھو دیا۔

بھارت اب تک یہی کہہ رہا ہے کہ چین نے بھارت پر حملہ کرنے کا خیال ترک نہیں کیا اور معلوم نہیں کس وقت اس کی افواج حرکت میں آ جائیں۔ حالانکہ بھارت کو یقین ہے کہ چین ایسا نہیں کرے گا۔ کیونکہ اگر اس کا مقصود یہ ہوتا تو باوجود پے در پے کامیابیوں کے وہ واپس نہ جاتا اور وہ کم از کم آسام پر تو اسی وقت قابض ہو جاتا۔ اس کا مدعا صرف اپنی سرحد کی طرف سے مطمئن ہو جانا تھا اور جب یہ مقصد اس کا پورا ہو گیا تو خود ہی واپس لوٹ گیا۔

لیکن بھارت و چین کی اس آویزش کا اثر پاکستان پر ضرور پڑا' اور جب اس نے دیکھا کہ امریکہ باوجود اس کی احتجاج کے بھارت کو اندھا دھند فوجی اسلحہ فراہم کر رہا ہے' جو پاکستان کے خلاف استعمال کیئے جا سکتے ہیں تو اس نے چین سے سرحدی معاملات پر گفتگو شروع کر دی اور یہ مسئلہ بہت آسانی سے طے ہو گیا۔ اس دوران میں روس کا طرزِ عمل البتہ مشتبہ رہا' نہ اس نے کھل کر چین کی مخالفت کی اور نہ بھارت کو اپنی ہمدردی کی طرف سے مایوس ہونے دیا۔ کیونکہ وہ نہ امریکہ سے بگاڑنا چاہتا تھا اور نہ چین سے اپنی دشمنی کا اعلان کرنا پسند کرتا تھا' کیونکہ اگر ایک طرف اسے یقین ہے کہ چین اسکی

موجودہ روش کو پسند نہیں کرتا تو دوسری طرف یہ بھی جانتا ہے کہ اگر کسی وقت چین و روس میں ٹھن گئی تو سارا ترکستان اس سے کٹ کر چین سے مل جائے گا جس کے اثرات وہاں بہت قوی ہیں۔ بہر حال ان سیاسی گتھیوں کا آیندہ جو نتیجہ بھی نکلے لیکن بھارت و پاکستان کی کشیدگی یقیناً بہت بڑھ گئی اور بھارت کے مسلمانوں کا مستقبل یقیناً خطرہ میں پڑ گیا۔ کیونکہ اول تو پہلے بھی بھارت میں ہندو مسلم فسادات برابر ہوتے ہی رہتے ہیں اور ان کا شمار سیکڑوں تک پہونچتا ہے لیکن اس دوران میں انھوں نے زیادہ شدت اختیار کر لی۔

خصوصاً کلکتہ میں جو مظالم مسلمانوں پر ہوئے ان کا اعتراف خود مغربی بنگال کی حکومت کو بھی کرنا پڑا۔ اور اس طرح بھارت کا غیر مذہبی تصور حکومت خاک میں مل گیا۔

بھارت کا جمہوری مستقبل

اس میں شک نہیں بھارت (جس حد تک اس کے آئین و دستور کا تعلق ہے) غیر مذہبی جمہوری حکومت ہے، لیکن علاوہ یکسر ہندو حکومت ہے۔ وہاں کے اکثر عمال و حکام تنگ ہندو ذہنیت رکھتے ہیں اور کھلم کھلا مسلمانوں کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی ہندو مسلم فساد میں (جس کا آغاز ہمیشہ ہندوؤں کی طرف سے ہوتا ہے) مسلمانوں ہی کو زیادہ نہ گرفتار کیا گیا ہو اور انہیں پر مقدمے نہ چلائے گئے ہوں۔ بہر حال اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہاں کے ارباب حکومت سخت متعصب ہندو ہیں اور وہ مسلمانوں کو بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان چند مسلم افراد کو چھوڑ دیجئے جو اس وقت وہاں چند اہم عہدوں پر ممتاز ہیں کیونکہ اول تو ان کا عدم و وجود برابر ہے۔ اور دوسرے یہ کہ بھارت کی مسلم آبادی در اصل نام ہے، وہاں کے قصبات و دیہات کی آبادی کا سو وہ ہندوؤں کے نرغہ میں گھری ہوئی ہے اور حد درجہ تشویشناک زندگی بسر کر رہی ہے۔ یقیناً یہ ممکن نہیں کہ وہاں کے پانچ کروڑ مسلمان ترک وطن کرکے پاکستان یا کسی اور طرف چلے جائیں انہیں وہیں رہنا ہے، وہیں مرنا ہے، لیکن سوال یہی ہے کہ آیا وہ مسلمان رہ کر وہاں رہ سکیں گے یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر بھارت کی موجودہ ذہنیت بدستور یہی رہی (اور اس کے بدلنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، بلکہ اگر نہرو کے بعد یا ان کی زندگی ہی میں حکومت بدلی تو اس کا اور زیادہ خراب ہو جانا یقینی ہے) تو بھارت کا مسلمان صرف نام اور نقشہ مردم شماری کے لحاظ سے ممکن ہے مسلمان باقی رہے ورنہ ثقافتی و مذہبی حیثیت سے یقیناً بالکل ختم ہو جائے گا۔ یہی ہے جمہوری نظام حکومت کا وہ المیہ جس کی زیادہ روشن مثالیں انہیں ممالک میں نظر آتی ہیں جہاں اکثریت و اقلیت کی تفریق سیاسی نقطۂ نظر نہیں بلکہ مذہبی نقطۂ نظر پر قائم ہے اور جس کی بہترین یا بدترین مثال بھارت کی موجودہ جمہوری حکومت ہے۔

اس وقت بھارت جس سیاسی بحران سے گزر رہا ہے وہ اندرونی و بیرونی دونوں حیثیتوں سے کافی تشویشناک ہے۔ کانگریس کی وہ متصوفانہ پالیسی جس کی بنیاد گاندھی جی نے ڈالی تھی وہ تو در اصل اسی وقت رُک گئی تھی جب وہ قتل ہوئے، لیکن اس کے آثار کیر پرستاروں نے اسے بالکل ختم نہ ہونے دیا۔ غالباً اس لئے کہ اس نام سے وہ اپنے آپ کو حکومت کا زیادہ مستحق قرار دے سکتے تھے۔ اور مہا سبھائی یا جن سنگھی جماعت (جس نے گاندھی جی کو قتل کرایا تھا) ذرا پیچھے ہٹ گئی تھی۔ لیکن جب گاندھی جی کی موت کے تاثرات کم ہوئے اور آہستہ آہستہ ایوان حکومت میں غیر کانگریسی عناصر بھی شامل ہونے لگے تو ایوان حکومت میں اس کا تناسب بھی کم ہونے لگا اور ان کے کانگریسی عقائد بھی جن سنگھی عصبیت میں تبدیل ہونے لگے، یہاں تک کہ اب کانگرس اک مرد بیمار ہو کر رہ گئی ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس وقت دم توڑ دے۔

رہا معاملہ پاکستان و ہندوستان کے تعلقات کا، سو اس کی کشیدگی کوئی نئی بات نہیں، تقسیم ہند کے بعد ہی سے اس کا آغاز ہو گیا تھا۔ لیکن اب چین و بھارت کے اختلاف، پاکستان و چین کے اتحاد۔ امریکہ کی موجودہ پالیسی، مسلمانان کشمیر کی بے چینی، کلکتہ کے فسادات اور سیام سے مسلمانوں کے جبریہ اخراج نے اس کشیدگی میں زیادہ نزاکت پیدا کر دی ہے، جس کا صحیح اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف نہرو یہ فرما رہے ہیں کہ وہ آزاد کشمیر کی جنگ بندی لائن کو بھی توڑنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں اور دوسری طرف جن سنگھیوں کا یہ مضحکہ خیز مطالبہ ہے کہ پاکستان کے خلاف پولیس ایکشن سے کام لیا جائے جس کو سن کر مجھے ہنسی آتی ہے اور غالب کا یہ شعر سامنے آ جاتا ہے۔

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں اسکے توسن میں

بیت المال کا قیام
اور
زکوٰۃ و قربانی کی رقم کا تحفّظ

عید الفطر کی زکوٰۃ ہر صاحب نصاب مسلم پر ضروری ہے اسی طرح بقر عید کی قربانی بھی۔ اور شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جو کسی نہ کسی طریقہ سے ان کو ادا نہ کرتا ہو۔ لیکن یہ رقم خطیر ہمیشہ ضایع جاتی ہے۔ اس سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ حکومت براہ راست اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے اور زکوٰۃ سے جو آمدنی ہو اسے فوج یا قومی تعلیم پر صرف کرے اور قربانی کی رقم مویشیوں کی نسلی ترقی کے کام میں لائے۔

میں تمام ارباب حکومت سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس مسئلہ پر غور فرمائیں اور حکومت کو متوجہ کریں کہ ان دواداروں کو وہ اپنے ہاتھ میں لے کر کروروں روپیہ سالانہ کی قومی دولت کو ضائع ہونے سے بچالے اور اس کا صحیح مصرف تلاش کرے۔

میں علماء کرام اور دیگر ارباب علم و ادب کو بھی اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور اگر کوئی شرعی یا عقلی حجت اس تحریک کے خلاف پیش کی جاسکتی ہے تو اسے ظاہر فرمادیں۔

نیاز فتحپوری

ناسخ
ایک مطالعہ

فراق گورکھپوری

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ہو یا زندگی کا کوئی اور کام، کسی بات میں کچھ لوگ اوروں سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں اور اس لئے وہ بڑے
بڑے آدمی خیال کئے جاتے ہیں مگر کچھ لوگ بڑے آدمی ہوتے ہیں اور اس لئے وہ کسی بات میں اوروں سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً میر، آتش، انیس کے
کلام کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ محض بڑے شاعر نہیں تھے بلکہ غیر معمولی آدمی بھی تھے۔ یہ لوگ زبردست مفکر تھے، قوم کے رہبر تھے اور اگر شاعری
نہ بھی کرتے یا کچھ بھی نہ کرتے تو بھی اپنے ہمعصروں میں ان کی ہستیاں اوروں سے بلند مانی جاتیں۔ کارلائل کا قول ہے کہ ایک ہیرو ہر طرح سے ہیرو
ہوتا ہے (A hero is a hero at all points.) وہ کہتا ہے کہ شیکسپیر اگر زبردست ڈراما نویس نہ ہوتا تو ایک زبردست
سپاہی ہوتا۔ اردو کے مشہور شاعروں میں میر اور سودا میں غالب اور ذوق میں انیس اور دبیر میں، ناسخ اور آتش پر غور کیجئے کہ کون محض بڑا فن کار
تھا اور کون واقعی بڑا آدمی تھا۔ میں یہ سوال پیش کر کے خاموش ہو جاتا ہوں اور فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

فیصلہ آپ جو کچھ بھی کریں لیکن ناسخ کا نام آتے ہی کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کرنا اور لیڈری کرنا ناسخ کا پیدائشی حق تھا۔ ناسخ مفکر نہ ہی،
حقیقی معنوں میں زبردست شاعر بھی نہ سہی، اس کی تمام توجہ، تمام کوشش اور تمام زندگی نذر فروعات ہی سہی، ....
لیکن وہ کسی ماحول، کسی ملک، کسی طبقے اور کسی زمانہ میں ہوتا، تو بھی اس کی ہستی غیر معمولی ہستی مانی جاتی اور اس کی شخصیت کو نظر انداز کرنا آسان نہ ہوتا
بحیثیت شاعر کے آج آپ ناسخ کو جو چاہیں کہیں اس کے دو دیوان دیکھ کر اردو شاعری پر اس کے اثر کو دیکھ کر آپ اس کے تخلص کو تخریبی جو سمجھیں
یا تعمیری چیز، لیکن اس کی شخصیت میں وہ تیور ہے جو اردو کے تمام مشاہیر میں ہمیں صرف میر کی یاد دلاتا ہے۔ بحیثیت شاعر کے نہیں بلکہ ایک انسان
کے ناسخ کو میر کا مزاج ملا تھا۔ اس کے علاوہ ناسخ کی شخصیت میں ایک ڈپٹ ہے ایک تحکمانہ انداز ہے ایک کس بل ہے جو غالباً یقیناً میر کی
شخصیت میں بھی نہیں۔ ہے۔ انگریزی ادب کی تاریخ میں ناسخ کی شخصیت بن جانسن اور ڈاکٹر سیموئیل جانسن کی یاد دلاتی ہے۔ یہ تین کے تینوں
جسمانی حیثیت۔ سے پہلوانان سخن تھے اور اقلیم سخن کے حکمراں تھے۔ تینوں ڈکٹیٹر تھے۔ تینوں کے کارناموں اور اثرات میں جیسے کوئی مادی طاقت
مرعوب کن جسامت کام کر رہی ہو، تین کے تینوں جسم، دل و دماغ علمیت اور کلام کے لحاظ سے ٹھوس آدمی تھے۔ اگر آپ ان تینوں سے بہت
ناخوش ہیں تو بجائے ٹھوس کے ٹھس کہہ لیجئے۔ لیکن ان کا ٹھوس ہونا یقینی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ناسخ کی شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ کوہ
کندن وکاہ برآوردن، کاہ یعنی گھاس کتنی ہی بے حقیقت چیز ہو لیکن کوہ کنی ذرا ٹھوس کام ہے۔ بہرحال اگر میر کی نازک دماغی مسلم ہے اور آتش
کا بانکپن، تو ناسخ کا ٹھوس ہونا بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔

ذرا غور کیجئے۔ شیخ امام بخش ناسخ زندگی اور شاعری دونوں میں یتیم تھے۔ باپ کا نام خدا بخش تھا۔ وطن لاہور تھا، زمانہ کی گردش نے

باپ سے وطن چھڑوا دیا اور عالمِ غربت میں فیض آباد کا منہ دکھایا جہاں ناسخ پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ناسخ خدا بخش کے بیٹے بھی نہیں تھے بلکہ متبنیٰ تھے۔ خدا بخش کے مرنے کے بعد بھائیوں نے دعویٰ کیا کہ امام بخش کوئی نہیں ہوتے اور خدا بخش کی کل دولت انہیں ملنی چاہئیے۔ مگر ناسخ کی خود اعتمادی دیکھئیے کہ اُنہوں نے کہہ دیا کہ مجھے مال و دولت سے کچھ غرض نہیں جس طرح ان کو باپ سمجھتا تھا آپ کو سمجھتا ہوں۔ اتنا ہے کہ جس طرح وہ میری ضروریات کی خبرگیری کرتے تھے اس طرح آپ فرمائیے۔ اُنہوں نے قبول کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جائداد کے جھگڑے میں بدنیت چچا نے بسنی ردٹی اور گھی میں ناسخ کو زہر دیا۔ لیکن یہ زہر کارگر نہ ہوا۔ کچھ پیش نہیں جاتی ہے قسمت کے دھنی سے۔ عمر بھر کسی کی نوکری نہیں کی۔ پہلی دفعہ جب الہ آباد آئے راجہ چندو لال نے ۱۲ ہزار روپئے بھیج کر بلا بھیجا۔ اُنہوں نے لکھ بھیجا اب جاؤں گا تو لکھنؤ ہی جاؤں گا۔ راجہ موصوف نے پھر خط لکھا بلکہ ۱۵ ہزار روپے بھیجکر بڑے اصرار سے کہا کہ یہاں تشریف لائیے گا تو ملک الشعرا کا خطاب نوابوں کا حاضری دربار کی قید نہ ہوگی ملاقات آپ کی خوشی پر رہے گی۔ اُنھوں نے منظور نہ کیا۔ پھر سُنئیے کہ غازی الدین حیدر کے عہد میں جب ان کی تعریفوں کا آوازہ بہت بلند ہوا تو اُنھوں نے کہلوایا کہ اگر شیخ ناسخ ہمارے دربار میں آئیں اور قصیدہ سُنائیں تو ہم انہیں ملک الشعراء خطاب دیں۔ جب یہ پیغام ان کے شاگرد نواب معتمد الدولہ نے پہونچایا تو ناسخ نے کچھ مگر جواب دیا کہ مرزا سلیمان شکوہ بادشاہ ہو جائیں تو وہ خطاب دیں۔ ان کا خطاب لیکر میں کیا کروں گا۔ غازی الدین حیدر ذرا خطرناک آدمی تھے۔ ناسخ کو لکھنؤ چھوڑ کر غربت اختیار کرنی پڑی لیکن غازی الدین حیدر کے دربار میں نہ گئے اور اُن کے لئے یا کسی کے لئے عمر بھر کوئی قصیدہ نہ لکھا حالانکہ کچھ نقادوں کو اس کی حسرت رہ گئی کہ ناسخ قصیدہ کی طرف مائل ہوتے۔ اُردو شعراء پر جو سہل پسندی سے یہ حکم لگا دیا جاتا ہے کہ وہ لالچی، خوشامدی، دربار پرست اور ثروت پرست ہوتے ہیں یا ہوتے تھے وہ تصویر کا محض ایک رُخ ہے اور وہ بھی سب سے زیادہ نظر فریب اور دلکش رُخ نہیں ہے۔ مجھے تو اُردو شاعروں کی دنیا پرستی میں بھی ایک لطیف عنصر ملتا ہے۔ ناسخ کا دل کتنا بڑا تھا اس کی ایک جھلک تو ہم آپ نے دیکھ لی۔ اب دیکھئیے کہ شاعری میں بھی کس انداز سے بے یار و مددگار شخص اپنی دھاک بٹھا کر رہا، اور دہلی سے لکھنؤ تک بلکہ براعظم ہند کے اس تمام حصہ پر چھا گیا جہاں ہندوستانی زبان بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ ناسخ کی شاعری کس طرح شروع ہوئی اس کا حال مصنف آبِ حیات سے سُنئیے۔

> "شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ روایت ہے کہ ایک بار ناسخ نے آغازِ شاعری کا حال یوں بیان فرمایا کہ میر تقی مرحوم ابھی زندہ تھے جو مجھے ذوقِ سخن نے بے اختیار کیا۔ ایک دن اغیار کی نظر بچا کر کئی غزلیں خدمت میں لے گیا۔ اُنہوں نے اصلاح نہ دی۔ میں دل شکستہ ہو کر چلا آیا اور کہا میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں، فرشتہ تو نہیں۔ اپنے کلام کو آپ ہی اصلاح دونگا۔ چنانچہ عرصہ کے بعد پھر فرصت میں نظر ثانی کرتا اور رہنا تا۔ غرض مشق کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ لیکن کسی کو سُناتا نہ تھا۔ جب تک خوب اطمینان نہ ہوا مشاعرہ میں غزل نہ پڑھی۔ نہ کسی کو سُنائی۔ مرزا حاجی صاحب کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ سید انشا، مرزا قتیل۔ جرأت۔ مصحفی وغیرہ سب شعرا جمع ہوتے تھے سب کو سُنتا تھا مگر وہاں کچھ نہ کہتا تھا۔ ان لوگوں میں جو لون، مرچ سید انشا اور جرأت کے کلام میں ہوتا تھا وہ کسی کی زبان میں نہ تھا غرض سید انشا اور مصحفی کے معرکے بھی ہو چکے، جرأت اور ظہور اللہ خاں نوا کے ہنگامے بھی طے ہو گئے۔ جب زمانہ سارے ورق اُلٹ چکا اور میدان صاف ہو گیا تو میں نے غزل پڑھنی شروع کی۔"

گلستاں کی وہ روایت تو شاید آپ کو یاد ہو گی جس میں ایک شاعر شیخ سعدیؒ کے پاس آکر بد ہضمی کی شکایت کرتا ہے۔ سعدیؒ نے کہا کہ تو نے کوئی شعر کہا ہو گا اُسے سُنا۔ اس نے سُنایا اور وہ شعر سعدیؒ نے اس سے تین بار پڑھوایا اور پھر کہا کہ جا اب تیری بد ہضمی دور ہو گئی۔ ناسخ نے نوجوانی میں دن رات شعر کہتے ہوئے بھی جس صبر و استقلال، جس خود اعتمادی، سیر چشمی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے اُسے آپ نے دیکھا۔ اگر یہ قوت ارادی اور قوت انتظار کسی عاشق کو نصیب ہو تو شاید حسن بے نیاز کی تمکنت بھی ڈانواں ڈول ہو جائے۔ لیکن

دل ودماغ کے اُبھار کو اتنے دنوں تک دبائے رہنے کے لئے شعر کہہ کر اُسے پی جانے کے لئے شاعری کے ہنگاموں میں لب پر مہر سکوت لگا لینے کے لئے بڑے ٹھوس کردار بڑے سخت قوت ہاضمہ کی ضرورت ہے۔

اب آزاد ہی کی زبان سے ناسخ کے کچھ اور حالات سُنئے۔ کہتے ہیں "ابتدائے عمر سے ورزش کا شوق تھا، ۱۲۹ ڈنڑ کا معمول تھا کہ یا غفور کے عدد ہیں۔ یہ وظیفہ قضا نہ ہوتا تھا۔ البتہ موقع اور موسم پر زیادہ ہو جاتے تھے۔ جیسا ریاضت کا شوق تھا ویسا ہی ڈیل ڈول بھی لائے تھے۔ بلند بالا۔ فراخ سینہ مُنڈا ہوا سر۔ کھاروے کا لنگ باندھے بیٹھے رہتے تھے۔ جیسے شیر بیٹھا ہے۔ جاڑے میں تنزیب کا کرتہ بہت ہوا تو لکھنؤ کی چھینٹ کا دُہرا کرتا پہن لیا دن رات میں ایک دفعہ کھانا کھاتے تھے۔ ظہر کے وقت دسترخوان پر بیٹھے تھے اور کئی وقت کی کسر نکال لیتے تھے..... دسترخوان اُٹھتا تھا تو دو خوان فقط خالی برتنوں کے بھرے اُٹھتے تھے۔ قوی ہیکل بلونت جوان تھے۔ ان کی صورت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ۴-۵ سیر کھانا ان کے آگے کیا مال ہے۔"

"یہ بھی معمول تھا کہ پہر رات رہے سے ورزش شروع کرتے تھے۔ صبح تک اس سے فارغ ہوتے تھے۔ مکان مردانہ تھا۔ عیال کا جنجال رکھا ہی نہ تھا۔ اول نہائے اور پھر صحن میں کہ صفائی سے آئینہ رہتا تھا مونڈھے بچھے ہیں، اندر ہیں تو فرش اور سامان آرائش سے آراستہ ہے۔ صبح سے احباب اور شاگرد آنا شروع ہوتے تھے۔ دوپہر کو سب رخصت اور دروازہ بند۔ عصر سے پھر آمد شروع ہوئی۔ مغرب کے وقت سب رخصت۔ خدمتگار کو بھی باہر کیا اور اندر سے قفل بند کر دیا۔ کوٹھے پر ایک کمرہ خلوت کا تھا۔ وہاں کچھ سو رہے اور تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر فکر سخن میں مصروف ہوئے۔ عالم خواب غفلت میں پڑا سوتا تھا اور وہ خواب راحت کے عوض کاغذ پر خون جگر ٹپکاتے تھے۔"

"آداب محفل کا بہت خیال تھا۔ آپ تکیہ سے لگے بیٹھے رہتے تھے۔ شاگرد با ادب بچھونے کے حاشیہ پر بیٹھتے جاتے تھے۔ دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ شیخ صاحب کچھ سوچتے کچھ لکھتے۔ جب کاغذ ہاتھ سے رکھتے تو کہتے ہوں! ایک شخص غزل سُنانی شروع کرتا" اور یہ اصلاح دیتے جاتے۔

یہ تو تھا ناسخ کا معمول زندگی۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ ناسخ کی شخصیت ہمیں میر کی یاد دلاتی ہے۔ دونوں بے انتہا نازک مزاج تھے۔ یا ٹھیٹ زبان میں دونوں نہایت جھکی تھے۔ مگر میر کی جھک اور نازک مزاجی اور ناسخ کی جھک اور نازک مزاجی میں بڑا فرق ہے۔ میر کے بارے میں جو روایتیں مشہور ہیں وہ تلخ اور ناگوار ہوتے ہوئے بھی ایک لطیف اور تیز معنویت رکھتی ہیں اور میر کے مزاج کی شعریت میر کی شاعری اور میر کے متعلق ان روایتوں میں ایک نازک مطلب اور ہم آہنگی ہے:-

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا　　　اس کی ہر بات اک مقام سے ہے

لیکن ناسخ کی جھک اور نازک مزاجی ذرا مزاحیہ یا کامک قسم کی ہے مثلاً دوران فکر میں ایک دیرینہ دوست کا ناسخ سے ملنے آنا اور ٹال مٹول کے بعد بھی جب وہ نہ اُٹھے تو گھر میں آگ لگا دینا۔ کسی رئیس زادے کا ان کے یہاں آکر شیشے کے بچوں سے کھیلنا اور جب ایک بچہ اتفاق سے ٹوٹ گیا تو دوسرا یہ کہکر پیش کر دینا کہ اب اس سے شغل فرمائیے۔ دوران فکر سخن میں ایک پاس بیٹھے ہوئے شخص کا ایک تنکا توڑتے رہنا اور ناسخ کا ملازم کو یہ حکم دینا کہ ایک ٹوکری خس وخاشاک ان کے پاس لا کر ڈال دے۔ ایک فارسی شعر کا مطلب دریافت کرنے پر یہ کہکر کہ میں فارسی کا شاعر نہیں دوسروں سے باتیں کرنے لگنا اور پوچھنے والے کا نادم واپس آنا۔ شعر سُنانے کی فرمائش کرنے پر بالکل مہمل اور بے معنی شعر سُنا کر یہ دیکھنا کہ یہ شخص کچھ سمجھتا بھی ہے یا یونہی تعریف کرنے آیا ہے یا اپنے دیوان کی نقل پیش کر دینا کہ ملاحظہ کیجئے، یہ تمام لطائف وظرائف نہ صرف ناسخ میر کے رنگ طبیعت کے فرق کو نمایاں کرتے ہیں بلکہ دہلی کے مزاج شاعری میں جو داخلی پہلو ہے اور لکھنؤ کے مذاق میں جو خارجی پہلو ہے اس فرق کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ میر اور ناسخ دونوں کو خبط سہی — ہر کس بخیال خویش خبطے دارد۔

لیکن ناسخ کی شخصیت سے بڑھ کر جب ہم ناسخ کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو تاریخ ادب کی اس ستم ظریفی کی مثال ہمارے سامنے آتی ہے جس کی بدولت شاعری کا ریفارم کرنے والا حقیقی معنوں میں شاعر ہو ہی نہیں سکا۔ مثلاً میں یہ تو نہیں کہتا کہ اُردو ادب میں سودا شاعر نہیں لیکن اصلاح زبان اور اصلاح ادب میر سے اس نے زیادہ کی پھر بھی غزل میں کہاں میر کہاں سودا، انگریزی ادب میں بن جانسن کی استادی مسلم پھر بھی بغیر کاٹ چھانٹ کے کلام شیکسپیر وہ صحرائے خودرو ہے جس کی قوت نمو کے سامنے بن جانسن کی باغبانی دھری رہ جاتی ہے۔ یہی حال ناسخ اور آتش، انیس اور دبیر، داغ اور امیر کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناسخ پیدائشی لیڈر اور ڈکٹیٹر تھا۔ اس نے سختی سے تکمیل کے ساتھ اور جزرسی کے ساتھ اُردو زبان کو منضبط اور منظم کیا اور ہمیشہ کے لئے زبان اور بیان کی بدنظمیوں کو مٹا دیا اور اس معنیٰ میں کہ جتنا بڑا کلیکس (Classics) دیوان ناسخ ہے، آج تک اُردو کا کوئی اور دیوان نہیں ہو سکا۔ جس طرح آگسٹس (Augustus.) نے روم کو اینٹ کا پایا اور اُسے سنگ مرمر کا بنا کر چھوڑا اسی طرح جہاں تک زبان بیان اور شاعری کے خارجی اُصولوں اور میکنیکل قانونوں کا تعلق ہے ناسخ نے اقلیم غزل کو ایک خودرو جنگل پایا اور اسے کم از کم ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے ایک وسیع البسط بلاغ بنا کر چھوڑا۔ شاعرانہ حیثیت سے نہ سہی لیکن تاریخی حیثیت سے یہ معمولی کارنامہ نہیں۔ لوگ یہ اکثر بھول جاتے ہیں کہ دیوانِ ناسخ سے پہلے جو اُردو دیوان مرتب ہوئے تھے ان میں سب سے مشہور دیوان میر۔ دیوان سودا۔ اور جرأت۔ مصحفی اور انشا کے دیوان ہیں۔ ان دواوین کے مرتب ہونے کے پچاس برس کے اندر اندر دیوان ناسخ مرتب ہوا۔ لیکن مقابلہ کر کے دیکھئے تو دیوان ناسخ کی زبان میں اور ان کے بزرگ ہمعصروں کی زبان میں ایک صدی کیا شاید کئی صدیوں کا فرق نظر آئے گا۔ کہا جاتا ہے کہ جب پہلے پہل دیوانِ ناسخ کی کچھ جلدیں دہلی پہونچیں تو غالب، مومن، ذوق اور دوسرے اُستادوں نے کہا کہ اب تک جو انداز بیان رائج تھا اس کی آخری گھڑی آگئی ہم سب کو اب اسی نئے رنگ میں کہنا ہے۔ شیفتہ ایسا اہلِ نظر ایسا مرعوب ہوا کہ بمقابلہ آتش کے ناسخ کے یہاں اسے زیادہ نشتر نظر آئے۔

بحیثیت ادبی ڈکٹیٹر کے تو ناسخ کا ثانی کوئی ہوا ہی نہیں اور اب سے سو برس پہلے کے مغرور ہندوستان سے کسی کو خاطر میں نہ لانے والے لکھنؤ سے کم ورستیوں کی گت بنا دینے والے لکھنؤ سے اپنا لوہا منوا لینا جیسا میں کہہ چکا ہوں بڑی ٹھوس شخصیت کا کام تھا۔ اب بحیثیت شاعر کے اگر دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہایت ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں' صفائی کے کوچے میں آتے ہیں تو اکثر پھبتی پر اُتر آتے ہیں' ناجائز تصرفات بھی کر جاتے ہیں' کبھی کبھی غلط محاورہ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ عموماً خیال بندی کرتے ہیں اور ان کی اکثر نازک خیالیاں کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا مصداق ہوتی ہیں اور مصنف کاشف الحقایق نے بالکل صحیح رائے دی ہے کہ "وہ خیالات ناسخ کی بدولت بڑی کثرت سے احاطۂ غزل گوئی میں داخل ہو گئے جو درحقیقت احاطۂ غزل سرائی سے باہر ہیں۔ اس زور آزمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ واردات وجذبات قلبیہ اور دیگر امور ذہنیہ کے مضامین سے شیخ کی غزلیں معرا ہو گئیں اور غزل سرائی کا مطلب فوت ہو کر ایک ایسی قسم کی شاعری ایجاد ہو گئی جس پر قصیدہ گوئی اور غزل سرائی دو میں سے کسی کی تعریف صادق نہیں آتی۔"

خیر یہ تو صحیح ہے کہ ناسخ نے غزل کو غزل رکھا نہ قصیدہ رکھا بلکہ ایک معجون مرکب بنا دیا لیکن اس کے اشعار کی بلند آہنگی، انداز بیان کی تکمیل، بندش کی چستی، مصرعوں کا کس بل اور زور وہ چیزیں ہیں جو اس پہلوانِ سخن کے ۱۲۹ ڈنڑ کا اثر اس کی شاعری میں بھی نمایاں کر رہے ہیں اس کے معنی اور مفہوم کو آپ سراسر تصنع کہیں لیکن جہاں تک منضبط اسلوب بیان کا تعلق ہے ناسخ کے احسان سے اور تو اور غالب، ذوق، مومن، آتش اور ناسخ کے بعد کے اُردو زبان کے تمام شعرا گراں بار ہیں۔ یہ بات شاید ہمیشہ صیغۂ راز میں رہے گی کہ غالب نے جو ایک بہت بڑا حصہ اپنے اُردو دیوان کا منسوخ کر دیا اس نظم و نسخ میں دیوان ناسخ کا بھی فیصلہ کن اثر پڑا تھا یا نہیں۔ لیکن مصحفی، انشا، جرأت کی زبان تو دور رہی کیا زبان کا جو اسلوب آج ہمارا جزو دماغ ہو چکا ہے وہ اسلوب وہ انداز بیان غالب، ذوق اور مومن کے مروجہ دواوین سے مرتب ہو سکتا ہے۔

غالباً نہیں۔ یہ تو ہوا زبان پر ناسخ کا عالمگیر اور مستقل اثر۔ اب رہی ناسخ کی شاعری سو اس کے محاسن و معائب کچھ تو عرض کیے ہی جا چکے۔ لگے ہاتھوں یہ بھی کہدوں کہ باوجود تصنع اور مبالغہ کے اور باوجود آج سے سو برس پہلے کا لکھنوی شاعر ہوتے ہوئے بھی ابتذال سے جتنا ناسخ کا کلام پاک ہے اتنا آتش کا بھی نہیں تصنع اور خارجیت اس میں شک نہیں ناسخ کے یہاں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں لیکن ناسخ کے انداز بیان میں جو صفات ہیں وہ کا میاب داخلی شاعری کے لئے کہاں تک کارآمد ہو سکتے ہیں یا داخلی شاعری کی جھلک کہاں تک دکھا سکتے ہیں اس پر شاید بہت کم غور ہمارے نقادوں نے کیا ہے کیا آتش نے جہاں کھلی ہوئی تقلید ناسخ کی کی ہے اسکے علاوہ اپنے داخلی اور کامیاب کلام میں وہ ناسخ سے متاثر نہیں۔ امیر مینائی کا پہلا دیوان مرآۃ الغیب، ناسخ کے اسلوب سے پورا پورا فیضیاب ہوتا ہوا خارجی اور تمثیلی شاعری میں بھی ایک دلکش داخلی پہلو لیئے ہوئے ہے اور ناسخ کے خاندان ہی میں حضرت آسی غازی پوری شاگرد رشک نے تو اپنے یہاں ناسخ کی آواز سے میر اور غالب کی آواز ملا دی ہے ناسخ کی زبان میں میر کے رنگ کا حضرت آسی کا صرف ایک شعر سنیئے۔

کوچۂ زلف صنم میں اہل دل جاتے ہیں کیوں
اور جاتے ہیں تو دل سی چیز کھو آتے ہیں کیوں

آخر مثنوی گلزار نسیم تو خاندان آتش کی چیز ہے لیکن تصنع اور تکلف جس انداز سے یہاں دلوں میں چٹکیاں لے رہے ہیں اُسے کیا کہا جائے۔ کیا اس مثنوی پر ناسخ کی تحریک کا اثر نہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ناسخ پورے ہندوستان پر چھا گیا تھا اور اسکے حریف بھی اس کا اثر لئے بغیر نہ رہے۔ ناسخ کی شاعری اور شخصیت ایک شگون کا حکم رکھتی ہے۔ ناسخ کے شاگردان رشید اور براہ راست مقلد وزیر رشک، قلق وغیرہ کے کلام کو آپ جو کچھ کہیں لیکن اسی خاندان میں تعشق لکھنوی اور جلال لکھنوی نے جو زبان ناسخ میں نشتریت، بھردی ہے اُسے آپ کیا کہیں گے۔ اس سلسلہ میں ایک ایسا نام یاد آیا کہ میں خود چونک گیا۔ آج حسرت موہانی کی فارسی ترکیبوں میں مومن، معاملہ بندی میں جرأت، تشکیل بیان، رنگینی اور البیلے پن میں مصحفی کی آواز بازگشت ہم سنتے ہیں لیکن ان کی چست و چاق بندشیں اور اسلوب و زبان کی حیرت انگیز پختگی اگر ناسخ کی دین نہیں ہیں تو کس کی دین ہیں سب سے کامیاب پیروی ذرا کتراکے کی جاتی ہے۔ بہر حال ناسخ کا کلام چٹان کی طرح ٹھوس سہی لیکن یہ چٹان اتنی خشک و بے فیض نہیں کہ ٹھوکر ماریں تو اس سے صاف شفاف اور ٹھنڈے چشمے بھی نہ اُبل پڑیں۔

خود ناسخ اپنے رنگ کے فروعاتی عنصروں سے گزر کر دیکھئے کیسے کیسے شعر کہتا ہے:-

شب فرقت میں شمع کا کیا ذکر
زندگی کا چراغ بھی گل ہے

عشق جب کامل ہوا ہے عین حسن
آگ میں پڑ جائے جو شئے آگ ہے

روٹھے ہوئے تھے آپ کئی دن سے من گئے
بگڑے ہوئے تمام مرے کام بن گئے

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

شب فراق گئی روز وصل آپہونچا
طلوع صبح ہے عالم تمام روشن ہے

تیرے نظارہ سے ہو جاتی ہے کیا خاطر جمع
چھوڑ دیتا ہے پریشاں نظری آئینہ

جنوں پسند ہوا ہے مجھے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

دل کو خوش آتی ہیں صحرا کی ہوائیں پر خار
اب کسی سرو گل اندام سے کچھ کام نہیں

تمام عمر یونہی ہو گئی بسر اپنی
شب فراق گئی روز انتظار آیا

زاہد وہ بادہ کش ہوں کہ مانگوں اگر دعا
اٹھیں ابھی شراب سے بادل بھرے ہوئے

آتی جاتی ہے جا بجا بدلی
ساقیا جلد آ ہوا بدلی

آب حیواں ہوں بجائے شراب
ایسی اے خضر مجھ کو پیاس نہیں

چلا عدم سے میں جبراً تو بول اُٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار دیتا جا

تمام صفحۂ عالم ہے ایک ہی صفحہ
سرِ کتاب کا یہ اک ورق تمام نہیں

عشق سے کس کے دل کو لاگ نہیں
کون سا گھر ہے جس میں آگ نہیں

ایسے اشعار کہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہ اشعار ہیں جنھیں میر، غالب اور اقبال بھی اپنے مجموعے میں شامل کرنا باعثِ فخر سمجھتے۔ ناسخ اگر چاہتا تو ایسے اشعار کی ایک بہت بڑی تعداد کہہ ڈالتا لیکن وہ آیا تھا زبان کو سنوارنے لیکن وہ صرف زبان کا ہو کر رہ گیا اور شاعری بھول گیا۔

یومِ پاکستان پر
افکار
بصد فخر و مسرت
افسانہ نمبر
پاک و ہند کے مشہور و ممتاز افسانہ نگاروں کے تعاون سے
پیش کر رہا ہے
نیا سرورق ★ صفحات تقریباً ۳۰۰ ★ قیمت ۳ روپے
آج ہی اپنی کاپی محفوظ کرا لیجئے
یا ۱۲ روپے زرِ سالانہ بھیجکر یہ منفرد پیش کش مفت حاصل کیجئے
مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی،

ایک پروفیسرِ اقتصادیات کی شاعر بیوی

مزاحیہ ڈرامہ

…ر فتحپوری

افراد :-

عاقل :- معاشیات کے پروفیسر۔ شعر و موسیقی سے بیگانہ

ثریا :- پروفیسر صاحب کی جدید تعلیم یافتہ بیوی۔ شاعری کی دلدادہ۔

گلشن :- گھر کی ضعیف خادمہ۔

اختر :- پروفیسر صاحب کے دوست۔

…ل :- "گلشن۔ گلشن !"

…شن :- (دور کی آواز سے) حاضر ہوئی سرکار۔ (دروازہ کھول کر اندر آتی ہے)

…ل :- کیا تم کچھ کام کر رہی تھیں، گلشن !

…شن :- ہاں۔ میاں۔ گوشت بھون رہی تھی۔

…قل :- بیگم کہاں ہیں ؟

…شن :- وہیں باورچی خانہ میں ہیں۔

…ل :- کیا کر رہی ہیں ؟

…ن :- کچھ لکھ رہی ہیں۔

…قل :- اور گنگنا بھی رہی ہیں۔ کیوں ؟

…شن :- (دبی زبان سے) ہاں میاں۔ کبھی کبھی گنگنانے بھی لگتی ہیں۔

…ل :- شعر کہہ رہی ہونگی۔ وہ تو میں جانتا ہوں۔ ہمیشہ کام ہی کے وقت اُن پر شاعری کا دورہ پڑجاتا ہے۔ خیر ذرا خیال رکھنا اختر صاحب بھی کھانا ہیں…"

(دور سے گلشن گلشن کی آواز سنائی دیتی ہے اور گلشن واپس جاتی ہے)

…آواز :- کمبخت مرگئی جاکر۔ جب دیکھو کام ہی کے وقت غائب ہوجاتی ہے۔ (دروازہ کھلنے کی آواز)

…ل :- (بلند آواز سے) بیگم ! ذرا اِدھر آؤ۔

…یا :- (غصہ کے لہجہ میں) کیوں کیا کہتے ہو ؟

…اقل :- (نرمی سے) یہ گلشن پر اتنا عتاب کیوں ؟ خیریت تو ہے۔

ثریا :- (تیز غصہ کی آواز سے) گوشت جل کر کوئلہ ہو گیا۔ خدا جانے دیگچی بھونتے بھونتے کہاں غائب ہو گئی۔ اب میں اپنا سر کھلاؤں گی۔

عاقل :- (نرمی سے) مگر تم بھی تو وہیں باورچی خانہ میں تھیں؟

ثریا :- (برہمی کے تیز لہجہ میں) تھی، مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ہر وقت چولھے میں سر ڈالے بیٹھی رہوں۔

عاقل :- (نرم مگر طنزیہ لہجہ میں) مگر بیگم، یہ تو کوئی بات نہیں، تمہاری شاعری سلامت چاہیئے۔ گوشت جلتا ہی رہے گا۔ روٹیاں جھلستی ہی رہینگی، اس میں بگڑنے کی کونسی بات ہے؟

ثریا :- (بگڑ کر) میں پوچھتی ہوں کہ تمہیں میرے لکھنے پڑھنے سے کیوں بیر ہے۔ تم اگر یہ چاہتے ہو کہ میں بھی تمہاری طرح ہر وقت اس فکر میں مبتلا رہوں کہ غلہ کا بھاؤ کیا ہے، کپڑے کا نرخ کیا ہے۔ کتنا سونا یہاں سے باہر جاتا ہے اور کتنی شکر جاوا سے یہاں آتی ہے، تو میں صاف کہے دیتی ہوں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں، میں تمہارے کام میں حارج تو نہیں، تمہیں میرا مشغلہ کیوں برا معلوم ہو۔ خوب!

(اسی وقت باہر سے گلشن گلشن کی آواز آتی ہے)

عاقل :- (غصہ کے انداز میں) دیکھو اختر آگئے ہیں۔ میں باہر جاتا ہوں۔ کھانا بازار سے آجائے گا۔ آپ جائیے، شعر کہئے۔

(ثریا تنک کر چلی جاتی ہے)

(۲)

اختر :- خیریت تو ہے۔ اندر کیا کر رہے تھے آپ؟

عاقل :- (گرم لہجہ میں) کر کیا خاک رہا تھا۔ اب تو بیگم کی شاعری میری برداشت سے باہر ہوتی جاتی ہے۔

اختر :- (ہنس کر) شاعری کرتی ہیں تو کرنے دو، تمہارا اس میں کیا نقصان ہے؟

عاقل :- ہونھ! تمہیں کیا خبر ان کے ایک ایک شعر کی کتنی قیمت مجھے ادا کرنی پڑتی ہے۔ آج ہی انہوں نے ایک شعر کہا لیکن اس وقت جب گوشت جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ پرسوں بھی خیر سے ایک شعر فرمایا تھا، لیکن جب بلی سارا دودھ پی چکی تھی۔ کل ہی کی بات ہے کہ بندر آنگنے پاس سے میری شیروانی لے گیا اور جب وہ تار تار ہو گئی تو ادھر ایک شعر پورا ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مشق سخن چندن اور جاری رہی تو ہو گا کیا؟

اختر :- (قہقہہ لگاتے ہوئے) بھئی برا نہ مانو تو کچھ کہوں، بات یہ ہے کہ اس میں کچھ قصور تمہارا بھی ہے۔"

عاقل :- میرا۔ میرا کیا قصور ہے۔

اختر :- یہی کہ تم ان کے ذوق کا خیال نہیں رکھتے، اگر کبھی کبھی تم بھی شاعری سے دلچسپی لے لیا کرو تو کیا حرج ہے۔

عاقل :- عجیب باتیں کرتے ہو، جب ایک چیز سے مجھے لگاؤ ہی نہیں تو کیا خاک دلچسپی لے سکتا ہوں۔

اختر :- تاہم محض ان کی دل دہی کے لئے اگر مصنوعی طور پر اس کا اظہار کر لو تو کیا نقصان ہے۔

عاقل :- (کچھ سوچ کر) اچھا بھائی، یہ بھی کر دیکھوں گا۔

(۳)

(ایک ہفتہ بعد۔ ثریا بیگم تخت پر بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی ہیں، عاقل ایک کتاب ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوتے ہیں)

عاقل :- (ہنستے ہوئے) بیگم، لو، تمہارے لئے ایک عجیب چیز لایا ہوں۔ غالب کا دیوان! جرمنی کا چھپا ہوا۔ دیکھو کتنا خوشنما ہے۔

(تھوڑے وقفے کے بعد۔ ورق الٹنے کی آواز)

ثریا :- واقعی بڑا خوشنما ہے۔

عاقل :- غالب اس میں شک نہیں بڑا اچھا شاعر تھا۔ اور اس کا یہ شعر تو مجھے بہت پسند ہے :-

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالبؔ　　　جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

یقیناً چار گرہ کپڑے کی بھی ایک قیمت ہوتی ہے اور اس کے ضایع ہونے کا خیال ہر ذی شعور انسان کو ہونا چاہئے۔ کیوں، بیگم کیا خیال ہے تمہارا اس شعر کی بابت۔ کتنا اچھا ہے"

ثریا :- ہوگا، مجھے کیا معلوم۔

عاقل :- ہوگا! اس کے کیا معنی۔ کیا تمہیں شاعری سے دلچسپی نہیں رہی"

ثریا :- جی نہیں۔

عاقل :- (حیرت سے) اور یہ جو دو گھنٹے سر کھپا کر میں نے غالب کے اسی شعر کے جواب میں غزل کہی ہے، اسے کون سنے گا ؟

ثریا :- (ہنستے ہوئے) آپ اور غزل کیا کہنا ؟

عاقل :- ہائیں تم مذاق سمجھتی ہو، لو سنو۔ میری پہلی کوشش ہے لیکن شاید اتنی بری نہیں۔ پہلا شعر، پہلے شعر کو مطلع ہی کہتے ہیں نا! اچھا تو مطلع سنو :-

ہم نہیں وہ جنہیں آتا ہے پریشاں ہونا　　　مفت میں بیٹھے بٹھائے یونہی حیراں ہونا

ثریا (ہنسی ضبط کرتے ہوئے) سبحان اللہ۔ کیا کہنا۔

عاقل :- اچھا دوسرا شعر اسی سلسلہ کا ہے

کفِ افسوس کا ملنا کسے کہتے ہیں جناب　　　نام کس چیز کا ہے سر بگریباں ہونا

ثریا :- تو یوں کہیے کہ آپ نے نظم مسلسل تحریر فرمائی ہے۔

عاقل :- اسے نظم مسلسل کہتے ہیں ؟ اچھا تو آج یہی سن لو کل غزل بھی ہو جائے گی۔ تیسرا شعر اور بھی ہوا ہے جس میں میرا نام بھی ہے۔

تم وہاں کیوں گئے بیکار اے عاقلؔ　　　کس نے تم سے کہا وہاں جا کر پابجولاں ہونا

(ثریا بے اختیار ہنسنے لگتی ہے)

عاقل :- کیوں اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔

ثریا :- آپ کا مقطع تو تقطیع سے بالکل گر گیا۔

عاقل :- تقطیع سے گر گیا۔ یہ کیا ؟ لیکن گر جانے دو۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ بیس دفعہ تم سے نہیں دیگچی چولھے میں گر گئی۔ شعر تقطیع سے گرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا، اور تم نے ہر مرتبہ دیگچی گرا کر کم از کم دو روپیہ کی چوٹ دی۔

ثریا :- (بگڑ کر) دیکھو پھر تم نے وہی طعن و تشنیع کی باتیں شروع کر دیں ؟

عاقل (نرمی سے) بگڑو مو نہیں دیکھو اب میں شعر کہنے لگا ہوں۔ اور ہاں بیگم یہ جو غالب نے لکھا ہے کہ — "در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا" آخر اس کا مطلب کیا ہے ؟ یہ بات بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بیاباں کیا کوئی پانی ہے جو ٹپک سکتا ہے۔

ثریا :- "کیوں مجھے بناتے ہیں آپ! میں اور آپ جیسے قابل شخص کو کچھ سمجھاؤں ؟

عاقل :- "لاحول ولاقوۃ، شعر کو قابلیت سے کیا واسطہ ؟ لغت کی کتاب دیکھ کر چند الفاظ لکھ لیے۔ اور پھر انہیں جوڑ دیا اور کوئی مہمل سی بات کہہ دی، چلیے شعر ہو گیا"

ثریا :- بجا ہے، شعر کہنے کی یہ ترکیب آج ہی مجھے معلوم ہوئی۔ میں یونہی سنا کرتی تھی کہ شعر کا تعلق فنون لطیفہ سے ہے اور وہی شخص شاعر ہو سکتا ہے

جو قدرت کی طرف سے اس کا ذوق لے کر آیا ہو۔"

عاقل (بات کاٹ کر) شعر فن لطیف ہو یا فن کثیف مجھے اس سے بحث نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ زمانہ کی حالت تو یہ ہے کہ پیوند لگے ہوئے کپڑے بھی میسر آجائیں تو گویا بڑی بات ہے اور اُدھر جب دیکھئے دامن کا چاک گریباں تک پہنچ گیا ہے۔ کوئی پوچھے کہ ان دھجیوں کا کیا بنے گا اور ایسی فضول تعلیم کا اثر ملک کے اقتصادیات پر کتنا خراب پڑے گا۔ لیکن خیر یہ بات تو جھگڑے کی ہے۔ یہ بتاؤ کہ میری غزل کیسی رہی ؟

ثریا:- کیا کہنا جواب نہیں۔ غالب کی روح تڑپ گئی ہوگی۔

عاقل:- اچھا تو اب روز دو غزلیں مجھ سے لے لیا کرو۔ اب تو تمہیں شکایت نہ ہوگی کہ مجھے شادی سے کوئی لگاؤ نہیں۔"

(ثریا اُٹھ کر جانے لگتی ہے)

— کیوں — کہاں جا رہی ہو۔؟

ثریا:- کہیں جا رہی ہوں۔ آپ کو کیا۔ آپ تو کپڑے پہنئے اور کالج جائیے۔

(۴)

(شام کا وقت۔ ثریا بیگم تخت پر بیٹھی ہوئی تلاوت قرآن میں مصروف ہیں۔ عاقل اندر آتا ہے)

عاقل:- ہائیں! ابھی تک فارغ نہیں ہوئیں۔ کیا آج پورا کلام اللہ ختم کرنے کا ارادہ ہے۔"

(ہونھ کی آواز۔ اور — پھر تلاوت کلام مجید)

عاقل:- اجی، بولو تو سہی۔ یہ وظیفہ کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں، مجھے غزلیں سُنانا ہیں اور آپ خدا سے لو لگائے بیٹھی ہیں۔"

ثریا:- (غصہ ہو کر) لاحول ولا۔ ناک میں دم ہے۔ اس گھر میں اب نماز روزہ بھی دشوار ہو گیا ہے۔"

عاقل:- (نرمی سے) میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ جو دورہ آپ پر پڑا ہے، کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں۔"

ثریا:- (بگڑ کر) توبہ کرو، توبہ۔ نماز روزہ کیا کوئی بیماری ہے جس کا دورہ پڑتا ہے۔ آپ کے یہاں مذہب کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔"

عاقل:- مذہب کے ساتھ کون بُرا سلوک کرتا ہے۔ نماز روزہ میرا ایمان ہے اور شاید غالب کا بھی تھا۔ لیکن میں تو یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت تک تو تم نے بھول کر بھی کوئی سجدہ نہ کیا تھا۔ اب اس کا خیال آیا سو کیوں؟ اور وہ بھی اس زور شور سے کہ جب دیکھئے سفید چادر میں لپٹی ہوئی تیمم کا تودہ بنی بیٹھی ہیں۔"

ثریا:- چلو ہٹو، مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں، اللہ رسول سے مذاق مجھے پسند نہیں۔

عاقل:- مذاق۔ مذاق کیسا؟ میں تمہیں نماز پڑھنے سے نہیں روکتا۔ تلاوت قرآن سے باز نہیں رکھتا۔ لیکن ہر بات کی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ نماز چھوڑی تو اس طرح کہ بھولے سے بھی کبھی خدا کو یاد نہ کیا اور اب جو عبادت پر آئیں تو اس شان سے کہ گھر کو مسجد بنا دیا۔"

ثریا:- (تنک کر) خیر ہوگا۔ کسی کو کیا۔ میں نماز نہیں پڑھتی تھی تو خدا کا گناہ کرتی تھی۔ اور اب پڑھتی ہوں تو اپنے لئے۔ آپ کا اس میں کیا بیچ!

عاقل:- میرا بیچ یہ ہے کہ جس دن سے تم نے نماز شروع کی ہے۔ صرف دو غزلیں ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور مجھے اس مہینے میں پورا دیوان پورا کرنا ہے، آخر یہ کام کیسے چلے گا۔

ثریا:- آپ غزلیں کہے جائیے، مجھے سُنانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

عاقل:- اور تم برابر اسی طرح رات دن نمازیں پڑھتی رہو گی مانو گی نہیں؟"

ثریا:۔ نہیں مانوں گی۔

عاقل:۔ بہتر ہے۔ (چلا جاتا ہے)

(۵)

(مرغ کے بانگ دینے کی آواز۔ قدموں کی چاپ)

ثریا:۔ (بلند آواز سے) گلشن۔ گلشن!

گلشن (دور سے) حاضر ہوئی بیوی۔

ثریا:۔ (برہم ہوکر) میرا مصلا کیا ہوا۔ قرآن شریف کہاں ہے؟"

گلشن:۔ بیوی مجھے کیا خبر۔ آپ نے جہاں رکھا ہوگا وہیں ہوگا۔

ثریا:۔ (تیز آواز سے) تخت کے سوا اور کہاں رکھتی ہوں، یہیں جانماز تھی، یہیں کلام مجید تھا، اسی جگہ دلائل الخیرات تھی۔ تسبیح تھی۔ رحل تھی۔ اور اب کسی ایک چیز کا پتہ نہیں ہے۔ یہ کیا بات ہے۔"

گلشن:۔ (ڈرتے ڈرتے) بیوی بندر لے گیا ہوگا۔

ثریا:۔ (طعن سے) اور مصلا پر بیٹھا ہوا کلام مجید بھی پڑھ رہا ہوگا۔ نامعقول کہیں کی۔ جلد ڈھونڈھ کے لا۔ وقت جا رہا ہے۔

(دروازہ کھلنے کی آواز)

عاقل:۔ بیگم گلشن پر کیوں خفا ہو رہی ہو۔ مجھ سے پوچھو، لو۔ یہ ہے تمہارا تمام عاشور خانہ میری بغل میں، مگر خدا کے لئے یہ تو بتادو کہ یہ چلّہ کتنے دنوں کا ہے تاکہ میں اتنے زمانہ کے لئے کہیں اور کا لا مُنہ کرکے نکل جاؤں۔"

ثریا:۔ (بے اختیارانہ ہنس کر) خفا تو نہ ہوگے۔ اگر سچ سچ کہدوں۔"

عاقل:۔ یہ لو تمہاری جانماز، تسبیح اور قرآن سر پر رکھ کر کہتا ہوں کہ خفا نہ ہوں گا۔"

ثریا:۔ اچھا تو وعدہ کیجئے کہ آیندہ آپ کبھی کوئی شعر نہ کہیں گے۔

عاقل:۔ (سنجیدگی سے) کیوں، کیا تمہیں میری شاعری سے تکلیف پہنچی ہے۔؟

ثریا:۔ تکلیف سی تکلیف! کلیجہ پیپ ہو کر رہ گیا ہے۔

عاقل:۔ تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو جانے دو میں نے تو صرف تمہیں خوش رکھنے کے لئے شاعری شروع کی تھی۔ تم پسند نہیں کرتیں تو کیا میرا سر پھرا ہوا ہے کہ اپنا وقت خواہ مخواہ ان مہمل باتوں میں ضائع کروں۔"

ثریا:۔ ہاں، میری خوشی ہو چکی۔ اب میری مرضی یہی ہے کہ آپ اس سے توبہ کریں۔

عاقل:۔ اچھا میں توبہ کرتا ہوں۔ لیکن تم بھی توبہ کرو کہ اب ...."

ثریا:۔ خدا تمہیں شرمائے۔ نماز سے توبہ کراتے ہو، جس نے تم سے شاعری کی لت چھڑوائی۔

عاقل:۔ اور تم شاعری سے توبہ کراتی ہو، جس نے تمہیں نماز کی عادت ڈلوائی۔!"

(جنگ)

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ

علی شیر خاں۔ محلہ کھترانہ کلاں۔ رائے بریلی۔ یوپی۔

لالۂ صحرائی

احمر رفاعی

فضل الحسن شفقت ۱۴ فروری ۱۹۱۴ء کو ڈیرہ غازی خاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کی غرض سے ۱۹۲۰ء کے اوائل میں، مدرسہ پونو نامی ایک امدادی اسکول میں داخل ہوئے۔ مولوی پیر بخش اس اسکول کے مدرس تھے جن کی نگرانی میں قریب چار سال اس مدرسے میں زیر تعلیم رہے اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں آرٹ اسکول میں پانچویں جماعت میں داخلہ لیا جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ اور دوسرے کام مثلاً خراد، ڈرائنگ وغیرہ بھی سیکھتے تھے، علاؤ الدین صاحب اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، ایک دوسرے صاحب ماسٹر عبد الواحد صاحب اردو کے مدرس تھے اور ایک ہندو استاد ماسٹر کنھیا لال حساب وغیرہ کرایا کرتے تھے۔ لیکن شفقت کا رجحان پڑھائی کی طرف مطلق نہ تھا۔ اسکول چھوڑنے کی دھن اور کھیل کود کا ذوق پڑھائی میں برابر مانع آتا رہا نتیجہ کے طور پر متواتر دو سال تک مڈل میں فیل ہوتے رہے بالآخر ۱۹۳۰ء میں اسکول چھوڑ دینا پڑا، قریب ایک سال تک فارغ بیٹھے رہے لیکن کچھ عرصہ بعد والدہ کی سفارش سے والد نے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا یہ ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے۔

شفقت چونکہ اکلوتی اولاد تھے لہٰذا والدین کو ان سے خاص طور پر انسیت تھی، والدہ کا تو یہ حال تھا کہ رات کے اوقات میں جب تک شفقت مٹی کا دیا سامنے رکھے پڑھائی میں مشغول رہتے وہ محبت مادری کے تحت برابر ان کے قریب بیٹھی رہتیں، مذہبی شغف گو ان کے والد کے مقابلہ میں نسبتاً کم تھا لیکن نیک سیرتی میں اپنی مثال آپ تھیں۔ یکم اپریل ۱۹۳۴ء کو ڈیرہ غازی خاں میں انتقال فرمایا۔

اسی زمانے سے خوبیٔ قسمت سے ندیم جعفری کی صحبت میسر آ گئی جن سے یہ انگریزی کا درس بھی لیتے تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق ندیم صاحب ہی کی صحبت کا نتیجہ سمجھنا چاہیے، ندیم صاحب ہی کی عنایت سے انھیں مختلف ادبی رسائل مثلاً نیرنگِ خیال اور ہمایوں وغیرہ پڑھنے کو ملنے لگے، بیشتر ادبی کتب بھی جو اس دور میں شفقت صاحب کے مطالعہ میں آئیں ندیم صاحب ہی کی فراہم کردہ تھیں، صادق ایوبی سے بھی اسی زمانے میں مخلصانہ روابط استوار ہوئے جن کے افسانے ان دنوں مشہور رسائل میں بالعموم شائع ہوتے رہتے تھے صادق صاحب انگریزی افسانوں کا بھی ترجمہ کرتے تھے اور گاہ گاہ شعر بھی کہتے تھے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں۔

تیوری چڑھائی یار نے فرطِ عتاب میں * یا پڑ گئی شکن ورقِ آفتاب میں
شبِ وصل کی یاد آتی ہیں جب باتیں * افق پر جو رنگِ سحر دیکھتا ہوں

زمانے کی مجھ پر نگاہیں ہیں صادق ✖ میں اس بیوفا کی نظر دیکھتا ہوں

— صادق صاحب کے پاس اردو رسائل و کتب کا خاصا ذخیرہ تھا، اساتذہ کے کلام سے پہلے پہل انھوں نے شفقت صاحب اور ندیم جعفری کو روشناس کرایا ورنہ اس سے پہلے انھوں نے صرف اقبال، حفیظ اور احسان دانش کا نام سنا تھا، صادق ایوبی نے انھیں فانی، حسرت، شاد، جگر اور اصغر کے ناموں اور ان کے شاعرانہ مقام سے متعارف کرایا، صادق ایوبی ہی کے ایما سے شفقت نے مولانا حسرت کے رسائل "نکات سخن" وغیرہ منگائے، فانی کا دیوان "باقیات فانی" بھی صادق صاحب کے یہاں نظر سے گذرا۔

شفقت صاحب کے والد سید علی صاحب ۲۰ روپیہ ماہوار کے کانسٹبل تھے جس میں گزر اوقات ہی بمشکل ہوتی تھی لہذا شفقت خود کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے لیکن جب ذوق کی تشنہ سامانیاں بتدریج بڑھنے لگیں تو ایک دوست ماسٹر احمد بخش، مستری کے ماتحت ساڑھے چھ آنہ یومیہ پر ایک ماہ راج گیری کے قسم کا کوئی کام کیا کچھ پیسے جمع کئے " اور شعلۂ طور" اور کلام شاد منگوا کر مطالعہ کیا والدین ان کے اس ادبی ذوق میں حائل نہیں ہوئے بلکہ اور خوش ہوئے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ورناکیولر مڈل میں چھ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوگیا جس سے تعلیمی اخراجات بخوبی پورے ہونے لگے۔

شاعری کی ابتدا سنہ ۱۹۲۲ء میں ہوگئی تھی۔ اس وقت یہ ساتویں جماعت میں زیر تعلیم تھے۔ ندیم جعفری غزلوں کی اصلاح کیا کرتے تھے اور اس بنا پر یہ ماننا ہوگا کہ ان کے ذوق شعری کی نشو و نما میں ندیم جعفری کا بڑا گہرا دخل رہا ہے، اس معاملے میں صادق ایوبی کے مخلصانہ مشوروں کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں شفقت صاحب نے اپنی ابتدائی نظموں اور غزلوں کا ایک مختصر سا آٹھ صفحاتی مجموعہ "نغمۂ ناہید" کے نام سے شائع کیا جس کے اخراجات جو قریب تین چار روپیہ ہوتے تھے۔ چند ہم جماعت دوستوں نے پورے کئے۔ "نغمۂ ناہید" کے دو شعر یہ ہیں۔

؎ جب سے نگاہ یار نے بیمار کر دیا ✖ دل نے بھی کام کرنے سے انکار کر دیا
لوگوں سے پوچھتے ہیں وہ اک آہ کھینچ کر ✖ جاتے ہو کس غریب کا لاشہ لئے ہوئے

— مسلسل مشق کی بدولت سنہ ۱۹۳۵ء تک کلام میں خاصا نکھار پیدا ہو گیا تھا اور اس قابل ہو گیا تھا کہ لاہور کے مشہور روزناموں "شہباز" اور "احسان" وغیرہ کے سنڈے ایڈیشنوں میں باقاعدہ چھپنے لگا اسی سنہ کے اواخر میں مولانا حسرت سے کلیات منگوایا اور شاگردی کے لئے استدعا بھی کی "کلیات" کی قیمت تین روپیہ تھی اور شفقت صاحب کے پاس صرف دو روپیہ تھے لہذا انھوں نے مولانا کو لکھا کہ میں ایک طالب علم ہوں اور مستحق ہوں، صرف دو روپیہ ہیں جو میں نے بڑی مشکل سے پس انداز کئے ہیں اگر آپ اس قیمت میں اپنا کلیات مرحمت فرما سکیں تو بذریعہ وی پی بھجوا دیں، مولانا نے کلیات تو بھجوا دیا لیکن شاگرد بنانے سے معذوری کا اظہار کیا البتہ خط کے ساتھ جو دو غزلیں بھیجیں تھیں ان میں دو جگہ لفظ "نزع" غلط استعمال کیا تھا جس کی انھوں نے تصحیح کر دی اور لکھا کہ باقی غزل کی اصلاح سے معذور ہوں، مولانا کے اس انکار سے شفقت صاحب نے یہ اندازہ لگالیا

کہ دراصل میری اس کاہلی کی وجہ ہی سے مولانا کو میرے شاگرد بنانے میں تامل ہے چنانچہ اس واقعہ کے بعد مشقِ سخن اور تیز کر دی گئی اور کلیات حسرت کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے دواوین کا بھی بغور مطالعہ شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ کلام میں زیادہ سے زیادہ نکھار پیدا ہوتا چلا گیا۔ یہ مطالعہ ۱۹۳۶ء کے اواخر تک جاری رہا ۱۹۳۷ء میں مولانا کو پھر چند غزلیں بھیجیں اور شاگردی کے لئے درخواست کی۔ مولانا نے چند غزلیں اصلاح کرکے واپس بھیج دیں جو انھوں نے لاہور کے اخبارات "شہباز" اور "احسان" وغیرہ میں شائع کرا دیں۔ لیکن استادی شاگردی کا اس بار بھی کوئی ذکر نہیں آیا۔ ۱۹۳۸ء میں پھر کچھ غزلیں بغرض اصلاح ارسال کی گئیں جس کے جواب میں مولانا نے لکھا کہ اب تمھارے کلام میں بظاہر خامی نظر نہیں آتی لیکن ترقی کی بہت کچھ گنجائش موجود ہے مشقِ سخن جاری رکھیں اور جس وقت اپنا کلام بصورت دیوان ترتیب دے لیں مجھے بھیج دیجئے گا میں اس پر سرسری نظر ڈال کر جہاں کہیں کوئی خامی ہوگی اصلاح کر دوں گا۔ اسی زمانے میں پہلی بار شفقت کی دو غزلوں کے کچھ منتخب اشعار انھوں نے اپنے رسالہ "اردوئے معلےٰ" شمارہ بابت مئی جون ۱۹۳۶ء میں شائع کئے۔ جو درج ذیل ہیں۔

نظرِ لطف وکرم آپ سے ڈالی نہ گئی	ہم فقیرانِ محبت کی دعا لی نہ گئی
کچھ عجب چیز ہے آداب محبت کا لحاظ	ان سے مل کر بھی ہوسِ دل کی نکالی نہ گئی
نہ چھٹا حسنِ جنوں خیز کا لپکا نہ چھٹا	نہ گئی دل کی پراگندہ خیالی نہ گئی

دوسری غزل

یاد جب ان کی شریکِ دردِ وغم ہوتی گئی	خود بخود سب ہجر کی تکلیف کم ہوتی گئی
جس قدر بڑھتا گیا اس حسنِ رنگیں کا خیال	خاطرِ آزادِ بے پروائے غم ہوتی گئی
کاظمی ہم زندگی میں شعر کیا کہتے رہے	داستانِ دردِ وغم گویا رقم ہوتی رہی

شفقت اس کے بعد بھی متواتر غزلیں بھیجتے رہے لیکن مولانا بہت ہی مصروف انسان تھے بالعموم باہر رہا کرتے تھے پھر اس زمانے میں قریب قریب ہر سال حج کے لئے جایا کرتے تھے اس لئے جواب بہت کم ملتا تھا مولانا سے شفقت صاحب کی ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک خط وکتابت رہی لیکن اتنے طویل عرصے میں صرف ان دس بارہ غزلوں پر اصلاح کی جاسکی اور آٹھ مکتوبات وصول پائے جنھیں شفقت صاحب نے حرزِ جاں بنا رکھا ہے

اسی نو دس سال کے عرصے میں شفقت نے مولانا کے کلام کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی اور ان کے یومیہ دستور العمل کا مطالعہ کیا۔ ان کے اخلاق کی بلندی اور کردار کی پختگی کے سبب ان کے ساتھ انھیں ایک قسم کی والہانہ شیفتگی وعقیدت سی پیدا ہو گئی۔

حسرت کے کلام کی بنیاد چونکہ جذبات وواردات پر قائم تھی لہٰذا ان کے اتباع میں شفقت نے بھی واردات وجذبات کی ترجمانی کو اپنا شعار بنا لیا، ۱۹۳۹ء میں انھوں نے ایک غزل کہی جس کا مطلع ہے

بنائے دوستی عزیزوں نے اس کا فرسے ڈالی ہے — میرے ذوقِ وفا کوشی کا اب اللہ والی ہے

یہ غزل اصلاح کی غرض سے مولانا کی خدمت میں بھیجی گئی، غزل چونکہ ایک خاص تاثر کے تحت کہی گئی تھی بنا بریں اس کے کم وبیش تمام اشعار بڑے ہی اثر انگیز تھے، یہ غزل مولانا کو پسند آگئی اور پوری کی پوری

اردوئے معلیٰ (شمارہ بابت ستمبر ۱۹۳۹ء) میں اس عنوان کے ساتھ شائع کر دی :۔

"غزل شفقت کاظمی شاگرد حسرتؔ موہانی"

جب شفقت صاحب نے اپنے نام کے ساتھ پہلی بار شاگرد حسرت موہانی لکھا دیکھا تو عین فطری طور پر انھیں بے اندازہ مسرت ہوئی، اس خوشگوار تقریب تعلق نے سمند شوق کے لیے تازیانے کا کام کیا مشق سخن تیز سے تیز تر ہو گئی، اب تک شفقت غزل اور نظم دونوں کہا کرتے تھے لیکن اب مولانا حسرت سے جذباتی لگاؤ کے اظہار کے لیے بطور صرف غزل ہی کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنا لیا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۹ء تک مشق سخن برابر جاری رہی۔ لیکن اس کے بعد کچھ ایسی پریشانیاں لاحق ہوئیں کہ یہ شغلہ ترک ہو گیا اور مسلسل ۱۹۵۴ء تک مہر بلب ہی رہا۔ اس پانچ سال کے عرصہ میں ایک شعر نہیں کہا البتہ اس دوران میں بھی بعض رسائل میں ان کی پہلے کی کہی ہوئی غزلیں برابر شائع ہوتی رہیں۔ لیکن جب ۱۹۵۴ء کے وسط میں اچانک اہلیہ کا انتقال ہو گیا تو ایسا معلوم ہوا گویا اس اندوہناک حادثہ کے نتیجے میں شعر و شاعری کے تمام سوتے یکبارگی ابل پڑے ہیں۔ حسرت کدہ اور نغمۂ حسرت کی متعدد غزلوں میں جو ۱۹۵۵ء کے بعد کی تخلیقات ہیں اس حادثے کی دھمک صاف سنائی دیتی ہے، بعض بعض غزلیں تو شروع سے آخر تک ایک ہی غم آگیں احساس سے بوجھل نظر آتی ہیں۔ مثلاً

کوئی مونس کوئی ساتھی نہ رہا تیرے بعد
یاد آتی ہے مجھے تیری وفا تیرے بعد

اب مجھے خندۂ عشرت سے سروکار نہیں
اپنی تقدیر پہ نوحہ سرا تیرے بعد

کس سے امید رہ و رسم محبت رکھوں
کون دیتا ہے مجھے داد وفا تیرے بعد

میں نے تدبیر تو کی اپنی طرف سے لیکن
کوئی تسکین کا پہلو نہ ملا تیرے بعد

اور بھی تیز ہوئی سینہ و دل کی دھڑکن
جب کبھی میں نے ترا نام لیا تیرے بعد

تو نے چھوڑا جسے بے یار تو کچھ دور نہیں
وہ بھی ہو جائے ہم آغوش فنا تیرے بعد

بارہا جو تری صحت کو اٹھائے میں نے
ہو گئے شل وہ مرے دست دعا تیرے بعد

نہ رہا کوئی مگر ذوق نظر کا ساماں
سونی سونی ہے زمانے کی فضا تیرے بعد

کچھ ادا ہو نہ سکا حق ترے احسانوں کا
ترے شفقت کو ہے اقرار خطا تیرے بعد

یہ غزل ۲۴ جولائی ۱۹۵۶ء کو کہی گئی اس کے کم و بیش سوا سال بعد ایک غزل اور ایسی زمین میں پھر لکھی جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ درد و غم کی پرچھائیاں کچھ اور گہری ہو گئی ہیں۔

زندگی کا کوئی امکاں نہ رہا تیرے بعد
ہر نفس ہے یہی پیغام فنا تیرے بعد

نہ سہی اپنا مقدر جو مجھے راس نہیں
میں بھی ہوں اپنے مقدر سے خفا تیرے بعد

اب کسی سے وہ تعلق ہے نہ وہ چاہ نہ پیار
ختم ہے سلسلۂ مہر و وفا تیرے بعد

یوں مرے خانۂ دل پر ہے اداسی طاری
جیسے اس میں کوئی آیا نہ گیا تیرے بعد

اپنی محرومیٔ قسمت کو دعا دیتا ہوں
نہ شکایت ہے کسی سے نہ گلہ تیرے بعد

میکدہ یاروں کو میکدہ درد کا احساس نہیں
جیسے دنیا سے اٹھی رسم وفا تیرے بعد

عیش ماضی کا تصور بھی فراموش ہوا — مجھ پہ گزرا ہے وہ طوفانِ بلا تیرے بعد
تجھ سے مل کر جو بآرام گزارے تھے کبھی — یاد کرتا ہوں وہی صبح و شام تیرے بعد
دلِ شفقت کہیں اس عالمِ حال میں زندہ اب تک — سخت مجرم ہے بآئینِ وفا تیرے بعد

—— ۱۹۵۵ء سے در اصل شفقت کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس کرب خفی و جلی کے ساتھ ساتھ جس کی سطورِ بالا میں صراحت کی گئی ہے شفقت کے خیالات و تاثرات میں ایک اور نمایاں تغیر نظر آتا ہے، اب تک شفقت نے صرف اساتذہ قدیم اور شعرائے متوسطین کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن ۱۹۵۵ء کے بعد جدید شعرا مثلاً فیض احمد ندیم قاسمی، عدم، عابد علی عابد، ناصر کاظمی اور باقی صدیقی وغیرہ کی شعری کاوشوں کو بہ نظر غائر دیکھنا شروع کر دیا، اس تمام گروہ میں فیض سے ....

—— وہ خصوصیت سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں، فیض کے کلام کی پر اسرار سی دلکشی اور اس کے لب و لہجہ کی نرمی و شیرینی خود شفقت کی مزاجی کیفیت سے ایک گہرا علاقہ رکھتی ہے مزید برآں فیض کا سر سبز و شاداب تخیل اس کی والہانہ دلسوزی اور دردمندی اور ساتھ ساتھ اس کی شاعری کا سحر کارانہ ایجاز و اختصار بھی شفقت کو خصوصیت سے مرغوب ہے فیض کے رنگ سے متاثر ہو کر شفقت نے تخیل و بیان کی ندرت و لطافت کی اہمیت کو محسوس کیا اور شعوری طور پر اپنے کلام میں ایک خاص قسم کا نکھار پیدا کیا جس میں قدیم و جدید دونوں رنگوں کا ایک خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے مثلاً۔

سہ نہ آئے راس دیارِ طرب کے ہنگامے ✱ پھر آ گیا وہ مسافر نوازِ صحراؤ
کبھی کبھی کے تصور سے دل نہیں بھرتا ✱ میرے خیال میں آؤ تو بار بار آؤ
مجھے بھی قافلے والو ذرا خبر دینا ✱ کہیں جو منزلِ مقصود کا پتہ پاؤ
بڑا کٹھن ہے غمِ دل کا راستہ شفقت ✱ خیالِ یار کی لہروں سے کھیلتے جاؤ

سہ بڑھتی گئی منزلوں کی دوری — ہوتے گئے گردِ کارواں ہم
جب پوچھ رہے تھے آپ ہم کو — اس وقت نہ جانے کہاں تھے ہم
کچھ بس نہ چلا تیری جفا پر — دیکھا کئے سوئے آسماں ہم
دل میں تھیں کچھ ایسی حسرتیں بھی — تجھ سے جو نہ کر سکے بیاں ہم
پلٹیں آئے نہ جانے کیا سفر میں — گھر سے تو چلے ہیں شادماں ہم

—— شفقت کے دو شعری مجموعوں "نغمہ حسرت" اور "حسرت کدہ" میں بیشتر دوسرے دور ہی کا کلام موجود ہے۔، قدیم غزلوں میں صرف چند شامل کی گئی ہیں۔ لیکن اس بیان سے مغالطہ نہ ہو شفقت علی الاعلان دبستانِ حسرت کے پیروکار ہیں، حسرت دراصل ان شاعروں میں سے ہیں جن کی نواسنجیوں نے ایک پورے دور کو متاثر کیا ہے، ابتداءً فانی حسرت ہی کے نقوشِ قدم پر چلنے کی سعی کرتے رہے۔ جگر نے بھی ان سے اثر قبول کیا ہے۔ گو کچھ عرصے بعد

ان دونوں حضرات نے اپنا اپنا مخصوص رنگ پیدا کر لیا۔ فانی اور جگر کے علاوہ اس دور کے اور دوسرے شعراء نے بھی حسرت کا پیار اسلوب اپنانے کی کوشش کی ہے جن میں جلیل قدوائی اور شفقت کاظمی سر فہرست ہیں، شفقت کے متعلق ایک نقاد کی رائے ہے"

"شفقت مغربی پاکستان میں دبستان حسرت کی تنہا یادگار ہیں اور اتباع کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں پیر و مرشد میں امتیاز باقی نہیں رہتا مختلف رسائل و جرائد کے مدیران نے شفقت کی غزلوں کو بار بار رنگِ حسرت کے عنوان سے شائع کیا ہے، اور اس میں شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں کہ شفقت نے شعوری طور پر اپنے استاد کا اسلوب اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم ان کے کلام کا تجزیہ کرتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ اپنی اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہیں مثلاً ان کی یہ غزل ملاحظہ فرمایئے جس میں حسرت کا رنگ کتنے بھرپور انداز میں جلوہ گر ہے۔

سہ کیا کیا نہ دلِ زار پہ لائے گی تباہی * اے حسن جفا کار ترے نیم نگاہی
خود سند نہ ہو جس سے ترا حسنِ دلارا * وہ بات کبھی اہلِ محبت نے نہ چاہی
خود ہم کو ہوئی ترکِ تمنا پہ ندامت * دیکھی نہ گئی آپ کی افسردہ نگاہی
اتنا بھی وہ غافل نہ ہو انجام ستم سے * لائے گی اثر شوق کی زاکرہ گناہی
آیا نہ کسی کام ترا حسنِ تصور * ٹالے نہ ٹلی شامِ جدائی کی سیاہی
آئینِ وفا سے کہیں بیزار نہ کر دے * شفقت کو ترے حسن کی بیگانہ نگاہی
*
دل جنت رشید ہے عرضِ وفا کے بعد * جیسے وہ کچھ کہیں گے مری التجا کے بعد
مضطر ہوا دل اور بھی ترکِ وفا کے بعد * پھر ابتدائے شوق ہوئی انتہا کے بعد
شوقِ الم نصیب کی تسکین ہو چکی * اظہارِ التفات ہے ناحق جفا کے بعد
لازم ہے انکشاف محبت میں احتیاط * آئے ہیں راہ پر وہ بڑی التجا کے بعد
احبابِ خیر خواہ کی شفقت نصیحتیں * مجھ کو قبول ہیں مگر ان کی رضا کے بعد
*

—— حسرت سے یہ وابستگی صرف کلام کی ہم رنگی و ہم آہنگی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی ایک نوعیت بالواسطہ سی بھی ہے، شفقت جہاں حسرت کی رنگین نگاریوں سے مسحور ہیں وہاں وہ ان کی شخصی خصوصیات کے پرستار بھی ہیں۔ حسرت کی شانِ استغنا ان کے کردار کی پختگی و عظمت ان کی بے باکی، بے نیازی اور صداقت شعاری سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے حسرت کی شاگردی صرف شعر و سخن کے میدان میں اختیار نہیں کی ہے بلکہ ہر شعبہ میں انھیں کو مشعل راہ بنانے کی عملی کوشش کی ہے اس بیان کو شفقت کی خوش فہمی پر محمول نہیں کیا جا سکتا، ان کے واقف کار اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ وہ اپنی سیرت و افتاد طبع کے اعتبار سے بڑی حد تک حسرت کا عکسِ جمیل نظر آتے ہیں ذہن و مزاج کی یہ ہم آہنگی ایک

اعتبار سے کچھ نفسیاتی پہلو لئے ہوتے ہے، اس معاملے میں ان عوامل و اسباب کو یقیناً ایک دخل ہے جو وراثتاً منتقل ہو کر ایک راسخ شکل اختیار کر گئے ہیں، بات یہ ہے کہ حسرت کی سیرت و شخصیت تو دراصل ایک آئینہ تھی جس میں شفقت نے غالباً پہلی بار اپنے اصل خد و خال کا مشاہدہ کیا اور اپنے آپ سے متعارف ہوتے، اس ضمن میں اگر ہم شفقت کے خاندانی پس منظر کا جائزہ لیں تو اس رائے کے اعتراف میں مضائقہ نہ رہے گا۔ شفقت کے والد سید علی[1] باوجودیکہ بیس روپیہ ماہوار پاتے تھے لیکن اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک قلندر صفت انسان تھے تعلیم معمولی تھی خود شاعر نہیں تھے لیکن مذہبی شغف گہرا تھا۔ جناب حسینؓ کے خاص طور پر معتقد تھے۔ مجالس بھی خوب پڑھتے تھے اور ایسے مواقع پر شفقت کی موجودگی خصوصیت سے ضروری سمجھتے تھے۔ غالباً یہ محبت پدری کے سبب سے تھا۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ غیر حاضری کی صورت میں ان کی باقاعدہ تلاش کروائی جاتی۔ سید علی پیشہ ور مجلس خواں نہیں تھے۔ لیکن مجالس پڑھنے اور سننے کا ذوق جنوں کی حد تک پہنچا ہوا تھا اس ذوق کی آسودگی کی خاطر۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں، بہاولپور، ملتان، اور خانیوال جیسے دور دراز مقامات کا پیدل سفر اختیار کرتے تھے۔ سفر خرچ کے طور پر دو چار روپیہ کافی ہوتے تھے، مرحوم باوجودیکہ کانسٹبل تھے لیکن سپاہیانہ خو بو بالکل نہیں تھے۔ یہاں تک ڈیوٹی کے اوقات کے علاوہ سرکاری وردی پہننا بھی عار سمجھتے تھے۔ زندگی یکسر فقیرانہ تھی ائمہ سے بے پناہ محبت تھی اور انھیں کے نقوش قدم پر چلنے کی تلقین کیا کرتے تھے، فقر و ایثار کی خصوصیات انھیں والدہ کی جانب سے ورثہ میں ملی ہیں شفقت کے اس خاندانی ماحول نے ان کے ذہن و مزاج کی نفسیاتی تشکیل میں یقیناً ایک خاص رول ادا کیا ہے، اس بنا پر حسرت کے ساتھ انکی یہ والہانہ وابستگی براہِ راست ان کی خاندانی تربیت و پرداخت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، ان کا یہ دھیما دھیما اور حد درک ساطب و لہجہ ایک خاص قسم کا وضعدارانہ رکھ رکھاؤ اور بے نیازانہ شان جو انھیں حسرت سے قریب تر کئے ہوئے ہے محض اتفاقی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی تہہ میں ان کے خاندانی اقدار نے خاص طور پر معاونت کی ہے جن سے شفقت کو کسی حال میں مفر نہیں تھا۔

ہم اپنی وفا کی لاج رکھ لیں
گلہ نہیں جو کسی نے مٹا دیا ہم کو
غم حیات کا شکوہ کسی سے کیا کرتے
ناکامیوں نے ساتھ نہ چھوڑا تو کیا ہوا

دنیا تو ہے بے اصول بیداد
بقدر جرم تمنا ملی سزا ہمکو
جو تھا الغیب میں شفقت وہی ملا ہمکو
شفقت کسی شوق میں یوں بھی گزر گئی

—— لیکن بایں ہمہ شفقت اپنی افتاد و طبع کے اعتبار سے بالکل حسرت ہی نہیں ہیں، ان کے کلام میں وہ تنوع بھی نہیں جو حسرت کے یہاں موجود ہے اور جس کے سبب انھیں اپنا کلام مختلف خانوں میں تقسیم کرنے

---

[1] سید علی صاحب کی پیدائش تقریباً ۱۸۶۷ء میں ڈیرہ غازی خاں میں ہوئی اور یہیں ۱۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو وفات پائی، والدہ سیدہ بخت بی بی کا سال وفات ۱۹۳۴ء ہے۔

کی ضرورت پیش آئی، شفقت کی زندگی بھی ایک خاص ڈگر پر بہتی رہی ہے انھوں نے زندگی کے وہ نشیب و فراز بھی نہیں دیکھے جن سے حسرت کو تمام عمر نباہ کرنا پڑا ہے حسرت کا ہر مشاہدہ ایک ذاتی اور عملی تجربہ کی سی حیثیت رکھتا ہے یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں محبت کی نو بہ نو کیفیات کا بڑا ابھرپور تجزیہ ملتا ہے، اس کے برخلاف شفقت نے بیشتر مطالعہ و اکتساب پر اکتفا کیا ہے، جس کی بنا پر ان کے یہاں ایک قسم کی یکسانی کا احساس ہوتا ہے، ان کے کلام کا ارتقا اسلوب و انداز بیان کے اعتبار سے تو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کے معنوی آہنگ، کو نظر میں رکھا جاتے تو اس کے محدود اور کچھ خصوصی دائروں میں محصور ہونے کا شدید احساس ہونے لگتا ہے، شفقت کا مطالعہ بھی حسرت کی طرح ہمہ گیر اور گہرا نہیں ہے، زندگی کا وہ اٹھان، وہ طنطنہ اور وہ ہماہمی جو حسرت کے یہاں اُجاگر ہے شفقت کے یہاں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا، حسرت کے یہاں سیاست کی چھوٹ اور سماجی افکار و خیالات کی مدھم پرچھائیاں بھی مل جاتی ہیں اور اس کے متوسط طبقے کی روایتی اقدار کی عکاسی بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن شفقت کے یہاں اس نوع کا کوئی شعور موجود نہیں، حسرت کو زندگی نے بہت کچھ دینا چاہا لیکن وہ اسے ٹھکراتے ہوئے بے نیازانہ بلکہ مستانہ اور قلندرانہ آن بان کے ساتھ آگے بڑھ گئے، اس کے برخلاف شفقت نے اگر زندگی سے بھی کچھ لینا چاہا تو وہ انھیں میسر نہ آسکا یہی سبب ہے کہ ان کے بے نیازانہ انداز میں فطرتِ انسانی کی ان نفسیاتی تاویلات کا ابھار بھی ملتا ہے جو تشنہ تکمیل آرزوؤں کی زخم رسیدہ کسک کو مندمل و متوازن کرنے کا دوسرا نام ہے۔ مثلاً۔

ہم کو لینا تھا کیا زمانے سے ✻ نامراد آئے نامراد گئے

—— حسرت کے سامنے زندگی کی بے کراں پنہائیاں ہیں، لیکن شفقت نے زندگی کا مطالعہ اپنے ہی عزلت کدہ کی چہار دیواری میں رہ کر کیا ہے، ان کے تجربات کی نوعیت بیشتر داخلی اور ساتھ ہی کچھ انفعالی قسم کی ہے جس میں ان کے ماحول کی ناسازگاریوں کا اندوہناک کرب کروٹیں لے رہا ہے ایک قسم کی شدید تشنگی ہے جو آس، امید اور التماس کی روپ انوپ لہروں کے بین بین پروان چڑھی ہے اور جا بجا بے اختیار پھوٹ بھی ہے مثلاً۔

دل کو ہے اعتبار ترے عہدِ شوق پر ✻ ہر چند عہد شوق ترا بے ثبات ہے
وہ اور درد اہلِ تمنا سے بے خبر ✻ جس کی ہر اک ادا ہے محبت اثر ہنوز
کیوں کر کہوں کہ آپ کو اس سے غرض نہیں ✻ وہ دل جو کھا رہا ہے فریب نظر ہنوز
ہے جوشِ اضطراب تری زندگی بخیر ✻ ملتی ہے اپنے حال کی تجھ سے خبر ہنوز
تجھ سے مخصوص ہے —— وفا اپنی ✻ تجھ کو بھولیں تو کس کو —— یاد کریں
آنکھ ہر چند تری دید سے محروم رہی ✻ شوق نے تجھکو بہ اندازِ نظر دیکھ لیا
تری نظر بھی دغا دے گئی ہمیں اے دوست ✻ تری نظر پہ بہت اعتماد تھا ہم کو
بیزار ہو سکے نہ تری آرزو سے ہم ✻ تھی شانِ اعتنا جو ترے اجتناب میں
پیش نظر مآلِ محبت ہے آج تک ✻ اپنی وفا پہ ہم کو ندامت ہے آج تک

آتا ہے کوئی یاد پس از ترکِ شوق بھی ✖ شاید مجھے کسی سے محبت ہے آج تک
مرتے ہیں زندگی کی ادا پر بھی ہم بہت ✖ گو زندگی کے نام سے وحشت ہے آجتک
اس بیوفا سے قطع تعلق نہ کر سکے ✖ جس بیوفا سے ہمکو شکایت ہے آجتک
شفقت کسی کی رنجش بیجا سے کیا کہوں ✖ وہ بھی شریکِ گردشِ قسمت ہے آجتک

—— طبع و مزاج کا کسی قدر فطری اشتراک انھیں میر کی طرف بھی لے گیا میر کا خصوصی لب و لہجہ اپنانے کے معاملے میں ان کی کوشش کسی حد تک کامیاب بھی کہی جا سکتی ہے، غالباً میر ہی کے واسطے سے انھیں شاد کے ساتھ بھی ایک قسم کا لگاؤ پیدا ہو گیا لیکن ان کے یہاں شاد کا رنگ اپنانے کا بظاہر کوئی رجحان نہیں پایا جاتا۔ البتہ اسلوب اور اندازِ بیان کی سحری سی مماثلت کہیں کہیں شاد کی یاد ضرور دلا جاتی ہے۔

بزم دنیا میں جی نہیں لگتا ✖ صدائے جنسِ وفا کی نایابی
تھا ذکرِ چمن چمن ہمارا ✖ آوازۂ صد بہار تھے ہم
دشمنِ جاں ہیں اب تو وہ شفقت ✖ تھا کبھی ان سے دوستانہ تھا
تیرے دیار کی راہیں انھیں پہ بند رہیں ✖ بصد خلوص جو ڈھونڈھا کئے پناہ تری
متاعِ جاں کو ترے نام پر نثار کیا! ✖ خوشا نصیب کہ یہ قرض بھی اتار آئے

—— شاد کی طبیعت ایک مخصوص گداز کی حامل ہے، اُن کے لہجہ میں ایک خاص قسم کی دل گرفتگی اور رقت ہے۔ شفقت کے یہاں بھی شاد کی یہ دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں لیکن شاد کی شاعری انہی دو خصوصیات ہی سے عبارت نہیں، ان کی شاعری کا کینوس اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ جس میں تصوف و اخلاق، فلسفہ اور پند و موعظہ اور اسی نوع کے دوسرے بصیرت افروز نکات کا اجتماع نظر آتا ہے لیکن شفقت کا مزاج ان چیزوں کا متحمل نہیں ہو سکتا، شفقت کی متاعِ خاص ان کا تغزل ہے خالص اور بے لاگ تغزل جو غمِ لاانتہا کی لالہ کاریوں سے معطر و منور ہے، ان کی طبیعت کا ٹھہراؤ اور جذبات کی دھیرج انھیں بہت کم اپنی مخصوص حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ اُن کے یہاں احساسات کا طوفان ضرور ہے لیکن ابال ہرگز نہیں، نیز ان کے غم میں بھی ایک خاص قسم کا شعور کارفرما ہے جو شورش و ہیجان سے کنارہ کش رہنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے۔ ان کے کلام کی ہمواری کا راز دراصل اسی نکتہ میں مضمر ہے۔

شفقت کے یہاں معاملات عشق و عاشقی کا وہ ہمہ گیر تنوع نہیں ہے جس کی جھلک اساتذہ کے یہاں نظر آتی ہے لیکن ان کے یہاں اظہار کیفیات و تاثرات کے باب میں ایک جچا تلا اور سنبھلا ہوا سا انداز پایا جاتا ہے جو قدرے محدود ہونے کے باوصف بڑا ہی موثر اور جاندار ہے مثلاً یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

شوق آوارۂ ہر راہ گزر ہے اب تک ✖ بہتر تھا کوچۂ جاناں سے جدا ہو جانا
میری بیباک نگاہی کا نتیجہ تو نہیں ✖ تیری شوخی کا بہ اندازِ جفا ہو جانا

اپنے احساسِ محبت سے ہیں نادم اب تک * ہم نے چاہا تھا کبھی تجھ سے جدا ہو جانا

کسلی کی یاد نہ جب تک شریکِ حال ہوئی * رہِ وفا میں قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

ہمارے حال کی جن کو خبر نہیں شفقتؔ * تعلقات انھی سے بڑھائے ہیں کیا کیا

یاروں کے التفات نے رکھ لی کسی کی بات * یاروں کا التفات بڑے کام آگیا

اسباب اور بھی مری بربادیوں کے تھے * کیا جانے کیوں زباں پہ ترا نام آگیا

—— شفقت کے تاثرات غم سے بوجھل ہیں لیکن نشاطِ غم کی آمیزش نے انھیں انتہائی حسین و دلپذیر بنا دیا ہے ان کے غم میں تلخی و زہرناکی ہی نہیں ایک تہہ در تہہ مٹھاس بھی ہے اُن کے عشق کا فطری تقدس اور جذبے کا بے پناہ خلوص اسی مٹھاس سے عبارت ہے جس نے ایثار و احترام کی دو طرفہ دھوپ چھاؤں میں نکھر کر اُن کی شاعری کی تمام فضا کو رنگین و کیف زا بنا رکھا ہے —

انتہا اپنی خواہشوں کی نہیں * مجھ پہ کب تک وہ التفات کریں

وہیں سے اہلِ ہوس کو ملی متاعِ سکوں * جہاں سے روحِ وفا بیقرار گزری ہے

مری حیات میں بے لطفیاں سہی لیکن * ترے جلو سے بڑی خوشگوار گزری ہے

مرغوبِ دل و جاں ہے ترا دردِ تمنا * وہ یوں کہ مجھے خواہشِ آرام نہیں ہے

بھولا ہے بہت شوق تیکہ ربطِ وفا پر * ناداں کو اندیشۂ انجام نہیں ہے

آئی نہیں ہم کو فراغت کی زندگی * دل ڈھونڈتا ہے پھر وہ محبت کی زندگی

یوں تلخیٔ حیات گوارا رہی مجھے * جیسے رہی نصیب میں راحت کی زندگی

ہر چند اپنا عہدِ فراغت بھی خوب تھا * لیکن عجیب تر تھی محبت کی زندگی

دنیا کے رنج و غم کا مداوا ضرور تھا * ورنہ کسے قبول تھی راحت کی زندگی

اڑاتی ہے اکثر نکہتِ گیسوئے یار اب بھی * مشامِ جاں ہے ممنونِ ہوائے نوبہار اب بھی

—— شفقت کسی آسودہ حال گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے ہیں ان کی زندگی سرتاسر محرومیوں اور ناکامیوں کے سہارے پروان چڑھی ہے ، خوشیاں ، یا تو انھیں میسر آئی نہیں یا اگر کسی وقت امید کی کوئی ہلکی سی کرن ___ نظر بھی آئی تو بہت جلد معدوم ہو کر رہ گئی ، ان کی شاعری کے پسِ منظر میں غم و الم کی جو ایک مسلسل کراہ سنائی دیتی ہے وہ دراصل ردِ عمل ہے ان کی ذاتی محرومیوں اور نامرادیوں کا جیسا کہ ایک جگہ خود انھوں نے اس حقیقت کی اس طرح صراحت کی ہے —

تشریح اپنے شعر کی شفقتؔ ہے اس قدر * لکھتے رہے فسانۂ رنجِ حیات ہم

—— اس ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شفقت کی نجی زندگی کے بارے میں مختصر طور پر کچھ عرض کر دیا جائے ، شفقت کی تعلیم صرف میٹرک تک ہے ، میٹرک انھوں نے ۱۹۳۶ء میں پاس کیا اس سے دو سال قبل ۱۹۳۴ء میں والدہ کا انتقال ہو چکا تھا ، میٹرک کرنے کے دو سال بعد تک زیادہ تر شعر و شاعری سے وابستہ رہا ، بالعموم روزانہ دور دور کھیتوں میں نکل جایا کرتے تھے ۔ جہاں دواوین کا مطالعہ اور شعر و شاعری

کا شغل ساتھ ساتھ رہتا تھا، ۱۹۳۸ء میں ملازمت کا خیال آیا لیکن اس زمانے میں ہندو زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے تھے اس لئے صرف وہی مسلمان ملازمت حاصل کر سکتے تھے جو کچھ اثر و رسوخ رکھتے تھے ــــ اور چونکہ یہ چیز اس فقیر بے نوا کو میسر نہ تھی لہذا ملازمت کے حصول میں پے در پے ناکامیوں سے سابقہ پڑتا رہا ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۸ء تک ایک سال تک امدادی پرائمری اسکول میں مدرسی کے فرائض انجام دیتے رہے، یہ وہی مدرسہ پون گرہ ہے جہاں کسی زمانے میں خود ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، تنخواہ صرف دس روپیہ ماہوار تھی لیکن چونکہ اپنی ضروریات محدود و مختصر کر لی تھیں لہذا اس قلیل تنخواہ میں بھی گزر ہو ہی جاتا تھا کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی نوبت کبھی پیش نہیں آئی۔

۱۹۳۹ء میں میونسپل کمیٹی ڈیرہ غازی خاں میں منشی محرر چنگی کی عارضی آسامی پر کام کرنے کا موقع ملا جہاں دو تین سال تک رخصتوں کے عارضی سلسلوں پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں سردار عطا محمد خان ریکروٹنگ آفیسر ڈیرہ غازی خاں کے ماتحت کلرک کی حیثیت سے کام کرنے کا اتفاق ہوا اور کئی بار رنگروٹ لے کر لاہور جانے کا اتفاق ہوا جہاں لاہور کی چند مشہور ادبی شخصیتوں مثلاً مولانا عبدالمجید سالک مرحوم لعنت اللہ خاں عزیز، خدا بخش اظہر امرتسری ایڈیٹر زمیندار کے علاوہ احمد ندیم قاسمی وقار انبالوی وغیرہ سے بھی ملاقات رہی، شفقت، مولانا عبدالمجید سالک کے حسن اخلاق، منکسر المزاجی اور شرافت نفسی سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس زمانے میں مولانا سالک سے جتنی ملاقاتیں ہوئیں ان میں مرحوم نے شفقت پر خصوصی توجہ فرمائی اور شعر و سخن سے متعلق بڑے مفید اور کار آمد مشورے بھی دیئے۔

۱۹۴۵ء کے آخر میں اس ملازمت سے استعفیٰ دے کر محرر چنگی کی مستقل آسامی پر آ گئے تنخواہ ۱۵ روپے اور گرانی الاؤنس ۱۱ روپے یعنی کل ۲۶ روپے ملنے لگے۔ ۱۹۴۶ء میں والد کی مختصر علالت اور انتقال کے جاں گداز حادثے سے دوچار ہوئے مرحوم ۲ اپریل کو بیمار ہوئے مرض نے بڑی تیزی سے شدت اختیار کی، بخار کی شدت میں بول چال بند ہو گئی اور دو روز بعد ہی ۴ اپریل کو انتقال کر گئے۔

شفقت ۱۹۴۷ء تک محرر چنگی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں ہندوؤں کے چلے جانے پر دفتر میں ریکارڈ کیپر کی آسامی پر تعینات کئے گئے۔ چنانچہ جب سے تا حال اسی جگہ پر مستقل مزاجی سے کام کر رہے ہیں۔ کام کی نوعیت شعر و شعاری کے لئے سم قاتل کے مصداق ہے۔ کچھ ایسی ہی تلخ صورت حال سے مرحوم نہال سیوہاروی کو بھی تمام عمر نباہ کرنا پڑا ہے۔ لیکن نہال بہت زیادہ جذباتی واقع ہوئے تھے اپنے احباب کی محفلوں میں بالعموم ان کی زبان پر یہ فقرہ آجاتا تھا "ہائے تضاد نے مار دیا، ہائے تضاد نے مار دیا" اور واقعی ایک روز اس خوفناک تضاد نے نہال کو مار ہی کر دم لیا، البتہ شفقت قدرے متحمل مزاج واقع ہوئے ہیں ان سے اگر اس موضوع پر گفتگو کیجئے تو بڑی بے نیازی کے ساتھ کہہ دیں گے۔

سفینہ جبکہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ ✱ خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

ــــ شفقت اس وقت ۴۸ - ۴۹ کے پیٹے میں ہیں، کلرکی کی مشقت نے شعر و شعاری سے کسی قدر بیگانہ کر دیا ہے پھر بھی جب کبھی طبیعت راہ دیتی ہے تو کچھ کہہ ہی لیتے ہیں، ان دنوں اپنا پہلا مجموعہ

داغ حسرت" کے نام سے ترتیب دے رہے ہیں۔

ڈیرہ غازی خاں ایک کم ترقی یافتہ بلکہ پسماندہ علاقہ ہے جس کا بیشتر حصہ ریگستان سے پٹا ہوا ہے۔ حمل ونقل کے معقول ذرائع نہ ہونے کے سبب یہ تہذیبی مراکز سے بھی کٹا ہوا سا ہے خود اس کی کوئی خاص تہذیبی و ثقافتی اہمیت نہیں ہے۔ یہاں کی عام زبان ملتانی ہے، قرب و جوار میں بلوچی کے اثرات غالب ہیں، تقسیم کے بعد انبالہ ڈویزن کے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد آجانے کے سبب یہاں اردو بھی عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن اسے معیاری اردو ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ غرضکہ ایک ایسے بے آب و گیاہ" خطے میں اردو کے ایک ایسے شیریں بیان شاعر کا وجود معجزہ سے کم نہیں۔ حقیقتاً یہ ڈیرہ غازی خاں کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے شفقت کو جنم دیا لیکن یہاں یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ یہ شفقت کی بدنصیبی ہے کہ وہ اسی شہر میں پیدا ہوئے۔ اگر وہ لاہور یا ایسے ہی کسی اور ادبی مرکز سے متعلق ہوتے تو آج نہ جانے شہرت و عروج کی کن منزلوں میں ہوتے، باینہمہ اس جبر مسلسل کا شکار رہ کر بھی انھوں نے جو گلکاریاں کی ہیں توقع ہے کہ ان کی لہک و مہک سے اردو کا ریاضِ شاعری تا دیر مہکتا رہے گا۔ ڈیرہ غازیخاں اپنے اس فرزند پر جس قدر فخر کرے کم ہے جو اس وقت اس کی سب سے زیادہ گراں بہا متاع ہے۔

مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ

مولانا نیاز فتحپوری کی معرکتہ الآرا تصنیف جس میں مذاہب عالم کی ابتدا، مذہب کا فلسفہ وارتقا، مذہب کی حقیقت، مذہب کا مستقبل، مذہب سے بغاوت کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مسیحیت کو علم و تاریخ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے

مشکلات غالب

غالب کے تمام مشکل اشعار اردو کا نہایت صاف و صحیح حل جو وضاحت بیان کے لحاظ سے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت ۲ روپے

عرضِ نغمہ

ٹیگور کی گیتانجلی کا سب سے پہلا اردو ترجمہ جو نایاب ہو گیا تھا وہ اب دوبارہ طبع ہوا ہے۔ معہ ایک بسیط مقدمہ کے قیمت۔ ایک روپیہ

ترغیبات جنسی

مولانا نیاز فتحپوری کی معرکتہ الآرا تصنیف جس میں فحاشی کی تمام فطری قسموں کے حالات۔ ان کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے

تاریخ کے گمشدہ اوراق

حضرت نیاز کے چوبیس افسانوں کا مجموعہ جو تاریخ اور انشائے لطیف کے امتزاج کا بلند ترین معیار قائم کرتے ہیں ان افسانوں کے مطالعہ سے واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دل کش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنھیں حضرت نیاز کی انشائے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت ۲ روپے

شبنمستان کا قطرۂ گوہرین

مولانا نیاز فتحپوری کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی کے بہترین شاہکار پیش کئے گئے ہیں ہر افسانہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک روپیہ ۲۵ پیسے

نگارِ پاکستان - ۳۲ - گارڈن مارکٹ۔ کراچی ۳

دُنیائے عیسویت کا ایک پُر عظمت و جلال باغی

والٹیر

نیاز فتحپوری

ایک زمانہ کے ملحدین اکثر و بیشتر دوسرے زمانہ کے مستند مقدسین میں شمار کیے گئے ہیں۔

پُرانی چیزوں کے بگاڑنے والے نئی چیزوں کے خلاق ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے پُرانی باتیں ختم ہوتی جاتی ہیں اور نئی چیزیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔

جسمانی دُنیا کی طرح عقلی دُنیا میں بھی عروج و زوال ہوتا رہتا ہے اور مسرت و شباب مدفون شدہ زمانہ کی قبر ہی کے پاس نظر آتے ہیں۔

عقلی ترقی کی تاریخ ملحدین کی سوانحعمریوں میں مل سکتی ہے۔ سیاسی آزادی غداروں کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اور آزادیٔ فکر و خیال ملحدین کے ذریعہ سے۔

سُلطان وقت کی مخالفت کرنا بغاوت تھی اور پادری کی مخالفت کُفر۔

تلوار اور صلیب صدیوں تک حلیف رہے اور دونوں نے متحد ہو کر انسانی حقوق پر حملے کیے۔

جیمس اوّل کہا کرتا تھا "پادری نہیں تو بادشاہ نہیں" وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ:۔ "صلیب نہیں تو تاج نہیں"۔ بادشاہ کے قبضہ میں لوگوں کے جسم تھے اور پادری کے ہاتھ میں ان کی روحیں۔ ایک اُن محاصل پر بسر کرتا تھا جو زبردستی وصول کیے جاتے تھے اور دوسرا اس خیرات پر جو ڈرا ڈرا کر جمع کی جاتی تھی۔۔ دونوں ڈاکو، دونوں گداگر!۔

یہ ڈاکو دو دُنیاؤں کو قابو میں رکھتے تھے بادشاہ قانون بناتا تھا اور پادری عقاید۔ دونوں اپنے اختیارات خدا سے حاصل کرتے تھے اور دونوں "لا انتہا" کے نمایندے تھے۔

ایک کا بار وہ اپنی جھکی ہوئی کمر پر اُٹھائے ہوئے تھے اور دوسرے کے اصول حیرت زدہ کھُلے ہوئے مُنھ کے ساتھ ماننے پر مجبور تھے۔

اگر عوام آزادی کا خیال دل میں لاتے تو بادشاہ ان کو کچل دیتا اور ہر پادری گویا ایک دیوتا تھا جو عقل رکھنے والے بچوں کا خاتمہ کر دیتا تھا۔

بادشاہ جبر کے ذریعہ سے حکومت کرتا اور پادری 'خوف' کے ذریعہ سے اور دونوں 'دونوں ذریعوں سے۔

بادشاہ نے عوام سے کہا۔ "خدا نے تم کو کسان بنایا اور مجھے بادشاہ۔ اُس نے تم کو مزدوری کرنے کے لئے اور مجھے عیش کرنے کے لئے پیدا کیا۔ اُس نے تمھارے لئے گدڑی اور جھونپڑا بنایا اور میرے لئے نفیس کپڑے اور محل۔ اُس نے تم کو اطاعت شعاری کے لئے پیدا کیا اور مجھ کو حکمرانی کے لئے۔ خدا کا انصاف یہی ہے"۔

پادری نے کہا:۔ "خدا نے تم کو جاہل اور کمینہ بنایا اور مجھے مقدس و فرزانہ تم بھیڑ ہو اور میں چرواہا۔ تمہارا اون میرا ہے۔ اگر تم میرا

...عت نہ کرو گے تو خدا تم کو یہاں بھی سزا دے گا اور دوسری دنیا میں بھی۔ خدا کا رحم اسی کو کہتے ہیں۔"

"دلیل پیش نہ کرو۔ دلیل باغیانہ جرم ہے۔ تردید نہ کرو۔ تردید خود رائی کا نتیجہ ہے۔ جس کے پاس کان ہیں اُسے صرف سننا چاہیئے، ...ر ماننا چاہیئے۔"

لیکن خوش قسمتی سے دُنیا میں غدار بھی پیدا ہوئے اور منکرین بھی، اور یہی وہ ہیں جنھوں نے اپنی جانیں دے دے کر صحیح معنے میں ...ع انسانی کی خدمت انجام دی۔ "عظمت کیا چیز ہے؟"

واجب عظمت وہ انسان ہے جو بضاعت علم میں اضافہ کرتا ہے، روح کو خوف کے پنجہ سے نجات دلاتا ہے۔ مجہول اور گمنام سمندروں ...عبور کرتا ہے قلم و فکر کو نئے برِ اعظم اور نئے جزائر عطا کرتا ہے اور فضائے دماغ میں ایک نئی کہکشاں پیدا کرتا ہے۔ بڑا آدمی تعریف یا اعلےٰ ...نام نہیں تلاش کرتا۔ وہ صداقت کی جستجو کرتا ہے وہ مسرت کی راہ ڈھونڈھتا ہے اور جو چیز وہ پالیتا ہے وہ دوسرے کو بھی دیتا ہے۔

بڑا آدمی تاریکی میں ایک مشعل ہے، اوہام کی رات میں منارۂ روشنی ہے — ایک الہام — ایک پیشین گوئی!

عظمت، تحفۂ عوام نہیں ہے۔ وہ کسی کو بہ جبر نہیں دی جا سکتی۔

بڑے آدمی حقیقتاً وہ لوگ ہیں جنہوں نے انسان کے جسموں کو آزاد کرایا ہے۔ وہ فلسفی اور مفکرین ہیں جنہوں نے روح کو آزادی ...لائی ہے۔ وہ ایسے شاعر ہیں جنہوں نے کروروں کی زندگی میں محبت کا نغمہ بھر دیا ہے۔ وہ ایسے مصور ہیں جنہوں نے حیات پریشاں ...بے رنگیوں کو عقل و فراست کے نقوش سے مزین کیا ہے۔ وہ، وہ سورما ہیں جنہوں نے جہالت و خوف کے ...یوتاؤں کو قتل کیا ہے۔ یہ لوگ وہ موجد، وہ محقق، وہ کاریگر اور سلطان العلوم ہیں جنہوں نے اس دنیا کو مہذب ...نایا ہے۔

پھر اس زبردست فوج میں سب کے آگے، ہم کو کون نظر آتا ہے وہ کون ہے جو سالارانہ عزم و ارادہ کے ساتھ لوائے حریت و آزادی ...ند کیئے ہوئے ہے۔

والٹیر! والٹیر!! والٹیر!!!

وہ انسان، جس نے دنیائے کلیسا میں ہلچل ڈال دی اور مذہبی خانقاہوں کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں — کسی پادری کے سامنے ...نام لے لو تو تمہیں ایسا معلوم ہوگا کہ گویا تم نے اعلان جنگ کر دیا ہے۔ اس مقدس پرستار کلیسا کے ہاتھ سے: امنِ ضبط و تحمل چھوٹ جائیگا ...ور اس کے منھ سے لعنت و ملامت کی آبشار جاری ہو جائے گی۔

سینچر، ۲۱ر نومبر ۱۶۹۴ء کو ایک بچہ پیدا ہوتا — اس قدر نحیف و ناتواں کہ سانس کو اُس کے جسم کے اندر رہنے میں تامل ہے، اُس کے ...الدین جلد از جلد اُس کو اصطباغ دلانا چاہتے ہیں۔ وہ بچہ کی روح کو نجات دلانے کے لئے پریشان ہیں کیونکہ انھیں یقین تھا اگر بپتسمہ لینے سے ...ل موت آگئی تو بچہ کی قسمت میں ابدی مصیبت و تکلیف لکھی ہے۔ اور خدا اُس بچہ سے نفرت کرتا ہے جس پر پادری کے ہاتھ نے پانی نہیں ...ھڑکا ہے — جس پادری نے پانی کے چند قطرے چھڑک کر اس بچہ کا نام فرانکوئس میری اروٹ Francois Marie Arouet ...ھا اور اس کی روح کو ہلاکت سے بچایا لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ اتنی تہوں میں لپٹا ہوا بچہ جو سانس بھی مشکل سے لے سکتا ہے۔ ایک دن آزادی ...کے گلوئے مرمریں کے اندر گڑوئے ہوئے درندۂ کلیسا کے پنجے علٰحدہ کرے گا۔

جب والٹیر "اس اسٹیج" پر آیا تو اس کے ملک کو "عیسائی" ہوئے تقریباً ۱۴۰۰ برس گزر چکے تھے۔ اس حال میں کہ بادشاہ قانون

بنا تا تھا اور مقدس اہل کلیسا ان کی منظوری دیدیتے تھے۔

اس نام نہاد اخوت عامہ کے عہد سعید میں ہر عدالت "شریعت تعذیب" کی حامی تھی اور ہر پادری اپنے شکنجوں اور آلہ ہائے تعذیب سے آسمانی بادشاہت قائم کرنے پر تلا ہوا تھا۔

برگزیدہ انجیل نے علوم و فنون کو نجس و ناپاک قرار دیدیا تھا اور آزادی کے ساتھ کسی خیال کا اظہار ایسا سنگین جرم تھا کہ مذہب کی تلوار کبھی اسے معاف نہ کرتی تھی۔

محبت کے خدا، اور ابدی باپ کے پرستار ظلم و جبر کے سوا کچھ نہ جانتے تھے اور وہ لوگوں کو مجبور کرتے تھے کہ اپنے جرم کا اقرار کریں اور اپنے ساتھیوں کا نام بتا دیں۔ الغرض "مذہب" کے پاس سوائے ظلم کے کوئی اصلاحی قوت باقی نہ رہ گئی تھی۔

یہ ۱۶۹۴ء کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب تمام مصنفین، بادشاہ اور پادریوں کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں سے اکثر جیلخانوں میں ڈال دیئے گئے، جلاوطن کردیئے گئے اور قتل کر ڈالے گئے۔!

—— جو تھوڑا بہت وقت جلادوں کو اپنے پیشہ کے فرائض سے بچتا وہ کتابیں جلانے میں صرف ہوتا تھا۔

انصاف کی عدالتیں ایک جال تھیں جن میں معصوموں کو پھانسا جاتا اور وہاں بیٹھ کر انصاف کرنے والے بھی گویا درۂ خداوندی تھے جنھیں انسانی جلد کو لہولہان کرنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہ آتا تھا۔

گواہ جن کو خود مبتلائے عذاب کا خطرہ رہتا تھا مجبوراً وہی کہتے تھے جو چرچ سننا چاہتا تھا۔

مافوق الفطرت اور حیرت انگیز ہستیاں دنیا پر حکمرانی کرتی تھیں۔ بات ہر ایک سمجھائی جاتی تھی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ جب کوئی بیمار پڑتا تھا تو وہ ڈاکٹر کو نہ بلا سکتا تھا بلکہ پادریوں کو طلب کرتا تھا اور یہ پادری بیماروں اور مرنے والوں کو تعویذ دیکر ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کیا کرتے تھے۔ دنیا کو بہ جبر تسلیم کرایا جاتا کہ یہ کاغذ کے ٹکڑے ہر قسم کی بیماری کو دفع کرسکتے ہیں اور اگر ان کو بچہ کے گہوارہ میں رکھ دیا جائے تو اس پر کسی قسم کا آسیب مسلط نہیں ہوسکتا۔ الغرض پادری یہی سکھاتے کہ تمام بیماریاں اور تمام مصائب خدا کا نام لینے سے دور ہوسکتے ہیں یعنی تمام امراض کا علاج، دعائیں، ریاضت، ولیوں کی ہڈیاں یا صلیب کی لکڑی چھونا، مقدس پانی چھڑک لینا یا جادو کا تیل جسم پر لگا لینا ہے۔

اُس زمانہ میں مرے ہوئے راہبوں کی روحیں بہترین معالج سمجھی جاتی تھیں اور ان کا نام لے کر کوئی گٹھیا اچھا کرتا، کوئی کھانسی، کوئی نزلہ دور کردیتا کوئی بخار، کوئی مرگی کو شفا بخشتا، کوئی سرطان کو کوئی مار گزیدہ کو اچھا کردیتا اور کوئی مبروص و مجذوم کو۔

"چرچ" کو یقین تھا کہ فضا میں صرف ارواح خبیثہ ہی بھری ہوئی ہیں، اور ہر گنہگار کے اندر شیاطین حلول کئے ہوئے ہیں۔

شیطان کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اُسے ہوا پر پوری قدرت حاصل ہے۔ بجلی، سیلاب، اور کہر وغیرہ پر اُسی کی حکومت قائم ہے۔

چنانچہ اس شیطانی حکومت کے انسداد کے لئے گرجے کی گھنٹیوں اور مقدس پانی سے کام لیا جاتا تھا یعنی ان گھنٹیوں پر مقدس پانی چھڑکا جاتا تھا اور جب وہ بجتی تھیں تو یہ تصور کیا جاتا تھا کہ فضائے آسمانی ارواح خبیثہ سے پاک ہوگئی ہے۔

اُس زمانہ میں نہ صحیح آزادی تھی نہ صحیح تعلیم، نہ صحیح فلسفہ، اور نہ صحیح سائنس۔ — جو کچھ تھا وہ اوہام پرستی تھی اور دنیا "چرچ" اور "شیطان" دو چیزوں کے قبضہ میں تھی!

"چرچ" کو شیاطین، ارواح خبیثہ اور جادوگروں کی ہستی پر کامل یقین تھا اور اس طرح "چرچ" اپنے ہر دشمن پر قابو پالیتا تھا۔ اس کے لئے اتنا کافی تھا کہ وہ کسی پر "جادوگر" ہونے کا الزام لگا دے، پھر یہ کام عوام کا تھا کہ وہ اُس "ساحر" کے جسم کا ایک ایک ریشہ

بیچ کر پھینک دیں۔ سحر و ساحری کے اعتقاد کا یہ عالم تھا کہ شوہر اپنی بیوی پر شک کرتا اور بیوی شوہر پر۔ لڑکے والدین کی طرف سے مشکوک تھے اور والدین لڑکوں کی طرف سے یہاں تک کہ اس وہم نے انسانی اخوت و محبت کے رشتوں کو توڑ دیا تھا، عدالتوں سے انصاف کو نکال دیا تھا، دوستی کے تعلقات کو منقطع کر دیا تھا اور حیات انسانی کے جام زریں میں سوائے زہر ہلاہل کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یہ تھا نتیجہ ایک "مافوق الفطرت ہستی" پر اعتقاد رکھنے کا، عقل انسانی کو معطل کر دینے کا، اور اپنے بجائے پادریوں پر بھروسہ کرنے کا!

جب والٹیر پیدا ہوا تو فرانس پر مذہب کی حکمرانی تھی۔ پادری حد درجہ عیاش تھے اور جج عموماً ظالم ــــ قصر شاہی کسبیوں کا گھر تھا اور عوام کے ساتھ جانوروں کی طرح سلوک کیا جاتا تھا ــــ مگر یہ ظلم کرنے والے اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ وہ کس طرح انقلاب کا بیج لوگوں کے دلوں میں بو رہے ہیں۔ اور وہ مزدور جن کی کمر خم ہوگئی تھی، جن کے چہرے دھوپ سے سیاہ ہوگئے تھے اور جن کے خون سے دوسروں کی کھیتی تیار ہوا کرتی تھی، جب قصر و خانقاہ کی عورتوں کے سفید گلے دیکھتے تو اُن کو کاٹ ڈالنے کے لئے کس کس طرح بیتاب ہو جاتے تھے۔

ایک "بڑے آدمی" یا "عظیم شخصیت" کا حال معلوم کرنے کے لئے ہم کو اُس کے ماحول سے بھی واقف ہونا چاہئے، اس لئے آئیے دیکھیں کہ والٹیر کے زمانہ میں دُنیا کی کیا حالت تھی۔

انگلستان میں جارج دوم بادشاہ تھا اور قانون کی رو سے ۲۲۳ جرائم ایسے تھے جن کی سزا موت تھی، قید خانے قیدیوں سے بھرے تھے اور قصاص گاہ میں ہر وقت آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی!

اسپین میں دماغی ترقی کے تمام راستے مسدود تھے۔ اسپین ــــ وہ اسپین جس نے یہود کو نکال دیا تھا یعنی اپنی عقل کو، وہ اسپین جس نے مسلمانوں کو نکال دیا تھا یعنی اپنی صنعت و حرفت اور اعلیٰ معیار زندگی کو ــــ اب بھی ہر ممکن ذریعہ سے ملک کو مذہبی بنانے کی کوشش کر رہا تھا!

پرتگال میں عورتوں اور بچوں کو اس جرم میں جلایا جا رہا تھا کہ کیوں انھوں نے اُس دن گوشت کھا لیا جس دن انہیں فاقہ کرنا چاہئے تھا ــــ اور یہ سب کچھ ایک نہایت رحمدل خدا کو خوش کرنے کے لئے ہوتا تھا!

اٹلی میں بھی پادریوں اور راہبوں کی حکومت تھی اور منکرین و ملحدین کے لئے "عدالتیں" وہاں بھی کثرت سے پائی جاتی تھیں۔ اور یہی حال جرمنی کا تھا۔

اس وقت تک والٹیر کو مذہب یا حکومت سے کوئی دلچسپی نہیں پیدا ہوئی تھی بلکہ اُس پر بعض طنزیہ تحریریں لکھنے کا الزام لگایا گیا اور بطور سزا اُسے جلاوطن کر کے ٹلے بھیج دیا گیا جو ۳۰۰ میل دور تھا۔ والٹیر نے یہاں سے لکھا کہ میں ایسے مقام پر ہوں جہاں اگر مجھے جلاوطن نہ کیا جاتا تو وہ میرے لئے سب سے زیادہ دل خوش کن مقام ہوتا۔ یہاں میری مسرت کامل میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے سوا اس کے کہ مجھے یہاں سے جلنے کی اجازت نہیں ہے۔

آخر کار اُسے رہائی مل گئی مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُسے پھر گرفتار کر لیا گیا اور اب کی مرتبہ اُسے ایک سال کے لئے بیسٹائل بھیجدیا گیا۔ یہاں کے قید خانہ میں اُس نے اپنا نام "والٹیر" رکھا اور اسی نام سے وہ آج تک مشہور ہے۔ اس کے بعد وہ انگلستان بھیجدیا گیا۔ اور یہاں وہ برطانیہ کے مشہور ادیبوں سے ملا۔

اب والٹیر مذہب کے بارہ میں تحقیقات کرنے لگا تھا اور رفتہ رفتہ اس نتیجہ پر پہنچ رہا تھا کہ مذہب منحصر ہے کتب مقدسہ کے الہامات پر، پاگل فقیروں کے خوابوں پر، "بزرگوں" کے جھوٹ پر، پادریوں کی چالاکیوں پر، مقدس راہبات کے ہسٹیریا کے دوروں پر، اور عوام کی بیوقوفیوں پر! اس کو اسی تحقیق کے دوران میں اس کا بھی پتہ چلا کہ ۳۲۵ء سے جب شاہ قسطنطین نے مذہب عیسوی قبول کیا تھا جو دھوپ

صدی کے آخر تک عیسویت کے متعلق نہ معلوم کتنی کانفرنسیں ہوئیں مگر چند معمولی باتوں کے سوا اور کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ والٹیر کو اب اس کا بھی احساس ہوا کہ ان احمقانہ عقائد کی وجہ سے دنیا میں ظلم و خوف کا دور دورہ ہو گیا ہے، تصویریں، چوبی صلیب، پرانی ہڈیاں اور لکڑی کے ٹکڑے آدمیوں کے حقوق اور ان کی زندگیوں سے زیادہ قیمتی سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان آثار کے محافظین نسل انسانی کے دشمن ہیں چنانچہ اس نے اپنی پوری قوت سے ان طاغوتی طاقتوں پر حملہ کرنا شروع کیا۔

والٹیر عقل سلیم کا بندہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں ایسی کوئی زبان نہیں ہو سکتی جس سے تمام زبانیں نکلی ہوں۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ ہر زبان پر اُس کے ماحول کا اثر ہوا ہے۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ برف اور برج کی زبان پھول پتیوں کی زبان نہیں ہو سکتی۔ وہ اس سے واقف تھا کہ منارۂ بابل کی کہانی غلط ہے اور اس کو اس چیز کا علم تھا کہ دنیا میں ہر چیز فطری ہے۔

والٹیر نہایت خوش مزاج، ظریف اور ہنس مکھ شخص تھا۔ اُسے غیر فطری عقاید اور مذہب کے خشک فلسفے سے سخت نفرت تھی اور اسی لئے عیسویت نے ہمیشہ اُس کی مذمت کی، اور وہ ہر فرقہ کے پادریوں کا نشانۂ ملامت بنا رہا۔

والٹیر نے یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ اپنے زمانہ کے توہمات کا خاتمہ کر کے چھوڑے گا۔ اور اُس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہر حربہ کو استعمال کیا۔ وہ مضحکہ اُڑانے، حاضر جوابی اور ظرافت میں یگانۂ عصر تھا اور اس نے ان تمام ذرائع سے خرافیات مذہب کا مقابلہ شروع کر دیا۔

والٹیر چاہتا تھا کہ پیروان مسیح کو مہذب بنایا جائے اور قتل و خون سے انھیں باز رکھا جائے چونکہ یہ اصلاح پادریوں کے مفاد کے خلاف تھی اس لئے اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ اگر وہ خود کوئی اپنا مذہبی فرقہ قائم کر لیتا اور چند "ملحدین" کو آگ میں جلا دیتا تو تمام عیسوی دنیا سے خراج تحسین وصول کرتا۔ اگر وہ پرانے افسانوں کو سچا باور کر لیتا، اگر وہ لاطینی دعاؤں کو یاد کر لیتا یا اگر وہ اپنے زمانہ کے عقائد کو تسلیم کر کے مان لیتا کہ ایک "لا انتہا" اور "رحمان و رحیم" خدا نے کروروں انسانوں کو محض ابدی عذاب میں مبتلا رکھنے کے لئے پیدا کیا ہے، اور یہ کہ اُس نے اپنی ساری طاقت و جبروت ایک چالاک اطالوی پوپ کو دیدی ہے، اگر وہ آسمانی "خدا" کی ناک میں جلتے ہوئے گوشت کی خوشبو پہونچانے کا سامان کرتا اور اس کے کانوں میں مظلوموں کی چیخوں کو بھر دیتا تو آج وہ مقدس والٹیر کہلاتا۔

والٹیر اپنے مضامین، طنزیہ اشعار، کامیڈی، ٹریجڈی، تاریخ، نظموں اور فسانوں کے ذریعہ سے پادریوں پر ۶۰ برس تک حملے کرتا رہا اور کبھی کسی کا محتاج نہ رہا۔ وہ کماتا بھی رہا اور اپنے مشن میں بھی مصروف رہا حتیٰ کہ ایک زمانہ وہ آیا جب وہ شاہزادوں کی طرح رہتا تھا اور یورپ کی ایک زبردست طاقت شمار کیا جاتا تھا۔

عیسائی کہتے ہیں کہ والٹیر سخت بے ادب تھا کیونکہ وہ مقدس چیزوں کا بغیر کسی سنجیدگی کے محاسبہ کرتا تھا، مذہبی مراسم کے موقعوں پر اپنے جوتے نہیں اُتارتا تھا۔ وہ موسیٰ کے علم طبقات الارض پر مسکراتا تھا۔ اجسام فلکی کے بارے میں انجیل کی تعلیم پر وہ ہنستا تھا۔ لیکن والٹیر کہتا تھا کہ جھوٹ خواہ کتنا ہی پرانا ہو جائے، سچ نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی بات اُس وقت تک قابل پرستش نہیں ہو سکتی جب تک دلائل سے یہ نہ ثابت ہو جائے کہ واقعی وہ پرستش کے قابل ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ تمام معجزے اور تمام مقدس اوہام اس کے تیر ملامت کا نشانہ بنے۔

وہ کہتا تھا کہ حماقتوں کا جواب صرف یہی ہے کہ ان کا مضحکہ اُڑایا جائے۔ اُس آدمی سے عقلی بحث کیونکر کی جا سکتی ہے جو یقین رکھتا ہے کہ صلیبی نشان رکھنے والی روٹی کے کھانے سے اُس نے خداوند ثلاثہ کو کھا لیا ہے اُس پادری کو کیسے قایل کیا جا سکتا ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک گھونٹ شراب کا پی کر اُس نے خدائے غیر متناہی کو پیٹ میں اُتار لیا ہے اور اُس انسان کو کیسے معقول کہا جا سکتا ہے جو اس امر کو مانتا ہے کہ مقدس روٹی کا جو حصہ بچے اُسے کونے میں چھپا کر رکھ دیا جائے تاکہ چوہیاں خدا کو نہ کھانے پائیں۔ بھلا بتلائیے کہ منطق اُس متشرع آدمی پر اپنا کیا اثر ڈال سکتی ہے جس کا یہ عقیدہ ہو کہ ایک مرتبہ تیس چالیس چھوٹے بچے ایک پیغمبر کو دیکھ کر ہنس پڑے تو خدائے رحمٰن و رحیم نے دو

ریچھوں کو بھیجا جنھوں نے بچّوں کو چیر پھاڑ کر کھا ڈالا جن لوگوں کی عقلوں کا یہ عالم ہو ان کو ان کی حماقتوں کا احساس کیسے کرایا جا سکتا ہے۔

اس کا علاج صرف یہی ہے کہ انہیں ہدفِ ملامت بنایا جائے اور ان پر ایسے تیر برسائے جائیں جو ان کے سینوں کو چھلنی کر دیں اور یہی وجہ ہے کہ والٹیر کو استہزاء کرنے والا بتایا جاتا ہے۔ اس نے بیشک مذاق اُڑایا لیکن کس کا؟ ان بادشاہوں کا جو ظالم تھے، ان خطاب یافتہ امراء کا جو مغرور و متکبر تھے، ان عدالت گاہوں کا جو جور و ظلم کا مرکز تھیں، ان پادریوں کا جو عقل انسانی کو دنیا سے محو کر رہے تھے، اُن مورخوں کا جو تاریخ کے صفحات کو جھوٹ سے بھر رہے تھے اور ان فلسفیوں کا جو اوہام پرستی کی تائید کرتے تھے۔

والٹیر برسوں تک، باوجود عالمگیر دور تظلم کے خدا کو اور بقول خود "مذہب فطرت" کو مانتا رہا اور اس دوران میں وہ اپنے عہد کے عقاید پر اس درجے حملہ کرتا رہا کہ وہ اس کے نزدیک قابل ملامت تھے وہ اپنے خدا کو ایک سرچشمۂ رحمتِ بے پایاں و انصاف بیکراں تصوّر کرتا تھا مگر مذہبی پیشوا جس خدا کو پیش کرتے تھے وہ حماقت اور علم کا مجسمہ ہوتا تھا۔ چنانچہ والٹیر نے اپنی پوری طاقت سے انجیل پر حملہ کیا۔ اُس نے انجیل کے بتائے ہوئے علم طبقات الارض، اس کے نظریات عدل و انصاف، اس کے قوانین، اس کے مراسم، اس کے معجزوں، اسکی کرامتوں، اس کی ظالمانہ دھمکیوں، اور اس کے مبالغہ آمیز مواعید کی دھجیاں اُڑا دیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اُس نے اُس خدا کی تعریف بھی کی جو ہم کو پانی دیتا ہے، غذا دیتا ہے، پھل دیتا ہے، پھول دیتا ہے، تندرستی دیتا ہے اور جس نے دنیا کو رعنائی اور حسن سے معمور کر دیا ہے۔

اُس پر خود بھی ہر طرف سے حملہ کیا جا رہا تھا مگر وہ اپنے حربوں سے جن میں عقل، منطق، دلائل، براہین، طنز، تمسخر اور استہزاء بھی کچھ شامل تھے۔ اپنے مخالفین سے جنگ کرتا تھا۔ اُس نے اکثر معافی بھی معافی مگر وہ معافی بھی ایک قسم کی توہین ہوا کرتی تھی۔ اُس نے کئی مرتبہ اپنی تردید بھی کی مگر وہ تردید گناہ سے بھی بدتر ہوا کرتی تھی۔ اس کی تعریف میں بھی زہر ہلاہل ہوا کرتا تھا اور اس کی پسپائی میں بھی سبقت ہوتی تھی۔

وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ پادری اُس کو زندہ جلوا کر اطمینان سے بیٹھ سکیں۔ چنانچہ اپنی تردید کے متعلق اُس نے لکھا تھا کہ "لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اپنے خیالات و الفاظ واپس لے لوں۔ بہت اچھا میں اس کے لئے بڑی خوشی سے تیار ہوں۔ میں یہ کہے دیتا ہوں کہ پوپ ہمیشہ حق پر ہوتا ہے۔ میں یہ مانے لیتا ہوں کہ اگر لوقا اور مارک (حضرت عیسیٰ کے حواریئین) ایک دوسرے کی تردید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو یہ بھی مذہب کی صداقت کا ایک ثبوت ہے اور یہ کہ مذہب کی سچائی اور خوبی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ وہ ناقابل فہم چیز ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ میں سب کچھ کہنے کو تیار ہوں بشرطیکہ مجھے چین سے بیٹھنے دیا جائے اور ایک ایسے شخص کے پیچھے نہ پڑا جائے جس نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔"

والٹیر نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی مظلوموں کی امداد کے لئے، بیکسوں کی حفاظت کے لئے، بے گناہوں کو بچانے کے لئے فرانس کے ظالمانہ قوانین کو مسترد کرانے کے لئے، پادریوں کے دلوں کو نرم بنانے کے لئے، منصفوں کو رحمدل کرنے کے لئے، عوام کو مہذب بنانے کے لئے اور لوگوں کے دلوں سے جنگ کی خواہش دور کرنے کے لئے!

کہا جا سکتا ہے کہ والٹیر کو خواہ مخواہ بہت بڑھا دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس موقع پر جرمنی کے مفکر اعظم "گئٹے" کے الفاظ نقل کر دینا مناسب ہوگا۔ وہ لکھتا ہے کہ:- "اگر تم عمق، فراست، ذہانت، ذکاوت، تخیل، لطافت، فلسفہ، علو، فطرت، تنوع، شادابی، گرمجوشی، سحر، نزاکت، زور، عقل رسا، نازک خیالی، خلوص، پاک باطنی، فصاحت، براغت، آب و تاب، چستی، تیزی، شوکت، رفعت، اور ترحم کو کسی ایک ہستی میں مجتمع دیکھنا چاہتے ہو تو والٹیر کو دیکھو۔"

ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے زمانہ کی وہم پرستیوں کا خاتمہ کرے مگر پھر بھی ہزاروں باپ ماں ایسے پائے جاتے ہیں جو توہم پرستی کے تو مخالف ہوتے ہیں لیکن اپنے بچّوں کے لئے اجازت دے دیتے ہیں کہ ان کے دماغوں میں، بیوقوف اُستاد دہشت و بہیمیت کا بیج بوتے رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے کوئی چیز اس سے زیادہ اہم نہیں کہ وہ آزاد ہے اور خوف سے بے نیاز!

ایک فانی مگر آزاد ہستی ہونا ایک غیر فانی غلام ہونے سے کہیں بہتر ہے!

اُس زمانہ میں خدا کے ماننے والے یہ کہا کرتے تھے کہ فطرت کی اسکیم میں ظلم و ستم کا عنصر نہیں ہے لیکن چونکہ ایک زندگی منحصر ہے دوسری زندگی پر اور ایک جانور زندہ رہتا ہے دوسرے جانور کی زندگی پر لہٰذا حیاتِ ادنیٰ کی قربانی، حیاتِ اعلیٰ کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ ان دلائل پر اکثر لوگ مطمئن تھے مگر پھر بھی ہزاروں آدمی ایسے تھے جن کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ ادنیٰ اعلیٰ پر کیوں قربان کیا جائے اور اب تو خوردبین کی امداد سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کا یہ نظریہ غلط تھا، کیونکہ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے جانوروں کی زندگی کو ان سے چھوٹے جانور ختم کر دیتے ہیں اور انہیں بڑے جانوروں کی حیات پر چھوٹے جانوروں کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ خود انسان بھی جراثیم کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کالرا کے جراثیم کو دیکھو کہ وہ کتنے چھوٹے ہیں لیکن انسان کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ بعض ایسے کیڑے بھی پائے جاتے ہیں جن کی غذا قلبِ انسانی ہے، یا جو انسانی پھیپھڑا کھاتے ہیں یا جو آدمی کی قوتِ بینائی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ غرضکہ اسی طرح کے سینکڑوں ایسے کیڑے ہیں جو انسان کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اعلیٰ زندگی، ادنیٰ زندگی پر قربان ہو رہی ہے۔

کچھ عرصہ تک والٹیر، پوپ کی رجائیت (Optimism) کا قائل رہا۔ مگر ۱۷۵۵ء میں جب ایک زبردست زلزلہ آیا تو رجائیت پسندوں کو مجبوراً یہ سوال کرنا پڑا کہ تمام دنیا پر رحم کرنے والے خدا نے سیکڑوں ہزاروں معصوم بچوں کو اس وقت جبکہ وہ اپنے گھٹنے اس کی بارگاہِ نیاز میں ٹیکے ہوئے اُس کی حمد کے گیت گا رہے تھے کیوں تہ خاک کر دیا۔ اس واقعہ نے والٹیر کا مذہب بدل دیا اور اُسے یہ یقین ہو گیا کہ یہ دنیا بہترین دنیا نہیں کہی جا سکتی ــــ خدا پرست، خاموش ہو گیا تھا! اور زلزلہ خدا کی ہستی سے انکار کر رہا تھا!

والٹیر کی انسانیت

اُس زمانہ میں ٹولوز مرجعِ خواص و عوام تھا۔ قدیم زمانہ کی اکثر یادگاریں کھنڈروں کی صورت میں یہاں موجود تھیں۔ یہاں کے لوگ جاہل مطلق تھے مگر ان کے پاس مذہب عیسوی کے ساتوں ولیوں کے خشک کپڑے کنواری مریم کے کسی لباس کا ایک حصہ، اور ان بیگانۂ عقل لوگوں کی جنہیں "مقدس" کہا جاتا ہے سیکڑوں کھوپڑیاں موجود تھیں۔ یہ لوگ عیسویت کی فتح اور اس پر مظالم کے سلسلہ میں دو رسمیں بھی نہایت تزک و احتشام سے منایا کرتے تھے انہیں لوگوں میں کچھ گھر پروٹسٹنٹ مذہب رکھنے والے عیسائیوں کے بھی تھے مگر چونکہ تعداد میں کم تھے اس لئے بہت خاموشی سے زندگی بسر کرتے تھے ان میں سے ایک آدمی جین کلاس نامی تھا۔ اس کے ایک بیوی اور چھ لڑکے تھے اور بذاتِ خود وہ بہت نیک سمجھا جاتا تھا۔ سب سے بڑے لڑکے نے قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی لیکن فراغت کے بعد اس سے یہ کہہ دیا گیا کہ تاوقتیکہ وہ کیتھولک نہ ہو جائیگا اُسے یہ پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ اس پر اُس بیچارے نے یہ کوشش کی کہ کسی ترکیب سے یہ معلوم ہی نہ ہونے پائے کہ میں پروٹسٹنٹ ہوں اور مجھے لائسنس مل جائے مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخرکار ایک دن نااُمید ہو کر اُس نے اپنے باپ کے توشہ خانہ میں خودکشی کر لی۔ اس واقعہ کو سن کر ٹولوز کے متعصب باشندوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ اُس کے والدین نے اسے خود ہی قتل کر دیا ہے تاکہ وہ کیتھولک نہ ہونے پائے۔ چنانچہ اس الزام میں لڑکے کے باپ، ماں، بھائی، ایک نوکر اور ایک مہمان کو گرفتار کر لیا گیا۔ مردہ لڑکے کو "شہید" تسلیم کر لیا گیا اور اُسکے جسم پر "چرچ" نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ایک "مقدمہ" چلا۔ بجز سماعی شہادتوں کے قتل کی اور کوئی گواہی بھی نہیں ملی، اور واقعات ملزم کے موافق تھے مگر پھر بھی ۹ مارچ ۱۷۶۲ء کو غریب "مجرم" کے ہاتھ پاؤں زنجیروں اور رسیوں سے باندھ دیئے گئے اور انہیں مخالف سمتوں کی طرف اتنا زور سے کھینچا گیا کہ جین کلاس کا ایک ایک عضو اُکھڑ گیا۔ اس کے بعد اُس سے جرم کے متعلق پھر سوال کیا گیا مگر مجرم نے اقبالِ جرم سے انکار کیا۔ تب اُس کے پیٹ میں زبردستی منوں پانی اُنڈیل دیا گیا مگر مجرم برابر اپنے جرم سے انکار کرتا رہا۔ اس کے بعد اُسے ایک لکڑی میں باندھا گیا اور اُس کے ہر عضو کے دو دو ٹکڑے کیے گئے مگر "مجرم" نے اقبالِ جرم نہ کیا۔ اس وقت وہ حالتِ نزع میں تھا مگر چونکہ دم نکلنے

میں کچھ دیر تھی لہذا اُس کا گلا گھوٹا جانے لگا اور آخر کار اس طرح ایک بے گناہ نے اپنا دم توڑا۔ ٹولوز کے ظالموں کو اس پر بھی چین نہ آیا اور کلاس کے پسماندگان کے پاس جو جائداد تھی اُسے ضبط کر لیا گیا، اس کے لڑکے کو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ عیسائی ہو جائے، ملازمہ کے سامنے یہ شرط پیش کی گئی کہ وہ ایک خانقاہ میں داخل ہو جائے۔ دونوں لڑکیوں کو بھی ایک خانقاہ بھیجدیا گیا اور غریب و بیکس بیوہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ در بدر بھیک مانگتی پھرے۔

والٹیر نے سارا قصہ سُنا تو اس کے بدن میں آگ لگ گئی، اُس نے کلاس کے ایک لڑکے کو تو اپنی حفاظت میں لے لیا اور خود مقدمہ کی پوری روئداد لکھ کر بادشاہوں، قانون دانوں اور مختلف ممالک کے ذمہ دار لوگوں سے اس مسئلہ پر خط و کتابت شروع کی جہاں روپیہ کی ضرورت ہوئی وہاں اُس نے روپیہ بھیجا جہاں خود جانا ضروری سمجھا وہاں خود گیا اور اپنی تحریروں سے سارے یورپ میں زلزلہ ڈال دیا۔ بالآخر "مجرم" بے گناہ قرار دیا گیا اور اس کی بیوہ اور بچوں کے لئے ہزاروں روپیہ چندہ جمع ہو گیا۔ یہ تھی والٹیر کی خدمت نوع انسانی کے لئے

خاندان سروِن کا قصہ

سروِن نامی ایک پروٹسٹنٹ لنگوئیڈاک میں رہتا تھا۔ بیوی کے علاوہ اُس کے تین لڑکیاں تھیں وہاں کے پادری نے یہ چاہا کہ ان میں سے ایک لڑکی کو وہ کیتھولک بنالے۔ قانون کی رو سے بچہ کی روح کو نجات دلانے کے لئے ایک پادری کو حق حاصل ہوتا تھا کہ بچہ کو اس کے والدین سے چھین لے، چنانچہ سروِن کی ایک چھوٹی لڑکی کو اُس سے جدا کر کے خانقاہ میں بھیج دیا گیا مگر وہ لڑکی گھر بھاگ آئی اور یہاں دیکھا گیا کہ اُس کی پُشت کوڑوں کی مار سے لہولہان ہے۔ اس کے بعد ہی ایک دن لڑکی اپنے گھر سے غائب ہو گئی۔ اور مکان سے تین میل کے فاصلہ پر اس کی لاش پائی گئی۔ پادریوں کی طرف سے شور مچایا گیا کہ لڑکی کے اعزہ نے اُسے کیتھولک ہونے سے بچانے کے لئے قتل کر ڈالا ہے۔ یہ واقعہ بھی اُسی زمانہ میں ہوا جب جین کلاس پر مقدمہ چل رہا تھا۔ سروِن مع اپنے اہل و عیال کے بھاگ کر اگر مقدمہ چلا تو ہم میں سے کسی کی بھی خیر نہیں۔ مگر سروِن کے بھاگ جانے کے باوجود اُس کی عدم موجودگی میں اُس کے خاندان بھر پر مقدمہ چلایا گیا، مقتول لڑکی کے باپ اور ماں کو پھانسی کی سزا دی گئی اور بقیہ دو لڑکیوں کو جلا وطنی کی۔

اب ان غمزدوں کا بیان سنیئے۔ یہ سب کڑکڑاتے جاڑے میں بھاگے تھے۔ سروِن کی بڑی لڑکی جسکی شادی ہو چکی تھی حاملہ تھی اور وضع حمل کا زمانہ قریب تھا۔ چنانچہ آلپس کی برفانی چوٹیوں پر اُس کے بچہ پیدا ہوا، ماں مصیبتوں کی تاب نہ لا کر مر گئی۔

والٹیر کو جب یہ حال معلوم ہوا تو ان کی دستگیری کے لئے بھی اس نے اپنا ہاتھ اور قلم بڑھایا اور اس فیصلہ کے خلاف وہ دس برس تک لڑتا رہا، اُس نے بادشاہوں سے چندہ کی اپیل کی۔ اور آخر کار دسویں برس اُسے کامیابی حاصل ہوئی —— یہ تھا والٹیر کا جذبہ محبت نوع انسانی کے لئے!

اسپینس کا واقعہ

اسپینس ایک کھاتہ پیتا پروٹسٹنٹ عیسائی تھا۔ سنہ ۴۰ء میں اُس نے اپنے گھر میں ایک پروٹسٹنٹ پادری کو ٹھہرایا اور اُس کو کھانا بھی کھلایا مگر چونکہ ملک کے قانون کے مطابق یہ فعل گناہ عظیم تھا۔ لہذا اسپینس کو حبس دوام کی سزا ہو گئی۔ والٹیر کو ۲۳ برس کے بعد یہ حال معلوم ہوا اور اُس کی مساعی کی بدولت اسپینس کو رہائی ملی۔

غرضکہ اسی طرح کی سیکڑوں ایسی مثالیں ہیں جن میں والٹیر نے بیواؤں، یتیموں، بیکسوں اور مظلوموں کی امداد کی۔ یہاں سب کی تفصیل بتانا مشکل ہے صرف ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے:-

سنہ ۶۵ء میں بمقام ابول، ایک پُل پر صلیب نما دو کڑیاں لگی تھیں ایک دن ان کو کسی نے چاقو سے چھیل دیا۔ دو نوجوانوں، شویلیر لابری اور ڈی اٹلونڈنی پر شک ہوا۔ مؤخر الذکر نے تو جرمنی بھاگ کر اور فوج میں بھرتی ہو کر جان بچائی اور مقدم الذکر پر مقدمہ چلا۔ دونوں کے خلاف

شہادت کوئی بھی نہ تھی مگر جو حکم سنایا گیا اس میں سزا کی تعیین اس طرح کی گئی تھی:۔

(۱) زبانیں گدی سے کھینچ لی جائیں

(۲) گرجا گھر کے دروازہ پر ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔

(۳) لوہے کی زنجیروں میں باندھ دیئے جائیں اور پھر بدن میں آگ لگا دی جائے۔

مقدمہ کی اپیل کی گئی۔ جس کی سماعت ۲۵ ججوں نے کی مگر عدالت ماتحت کا فیصلہ بحال رہا۔ اور یکم جولائی ۱۷۶۶ء کو حکم کی تعمیل بھی ہوگئی۔

جب والٹیئر کو اس سزا کا حال معلوم ہوا تو اس نے فرانس کو، جہاں ایسے مظالم ہو سکتے تھے، عمر بھر کے لئے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ پہلے تو اس نے ایک پمفلٹ لکھا جس میں واقعات مندرج تھے۔ پھر اٹلونڈی کا پتہ لگایا اور شاہ جرمنی سے سفارش کر کے اس کا نام فوج سے کٹوایا اور اسے اپنے پاس ڈیڑھ برس تک رکھ کر ریاضی ڈرائنگ اور انجینئرنگ کے فنون سکھائے یہاں تک کہ اٹلونڈی فریڈرک اعظم کی فوج میں انجینئر ہوگیا۔

والٹیئر بیکسوں اور مظلوموں کا حامی تھا اور ایک عظیم الشان بلندی سے دنیا کو دیکھتا تھا۔ وہ بہشت کے دروازہ سے اوہام کی فوج کو نکالنا چاہتا تھا تاکہ آدم کی اولاد شجر علم کے ثمر کا مزہ چکھ سکے۔ مگر پادری اس کی مخالفت کرتے تھے کیونکہ وہ شجر جہالت کے پھل فروخت کرتے تھے، جہاں تک اصول کا تعلق تھا وہ اپنے عہد کا بہترین قانون داں تھا۔ وہ قانونی اصطلاحات اور فیصلے نہیں جانتا تھا مگر یہ سمجھتا تھا کہ قانون کو کیسا ہونا چاہئے اور اس کا نفاذ کیسے کرنا چاہئے۔ وہ گواہی کے فلسفہ کو سمجھتا تھا، شک اور ثبوت کا فرق جانتا تھا اور اس نے اپنے عہد کے تمام مدبرین اور تمام قانون دانوں سے زیادہ ملک کے قوانین میں اصلاح کی۔ وہ زمانہ طالبعلمی میں دنیا کے بہترین مقرر سیسیرو کی کتابیں پڑھ چکا تھا اور انسانی مساوات کا علمبردار تھا۔ وہ کہتا تھا کہ:۔

"تمام انسان برابر پیدا ہوئے ہیں ——— اور ——— ہم کو نیک صفات اور قابلیت کی قدر کرنا چاہیئے۔"

وہ غلامی کا، خواہ وہ کسی صورت میں ہو، سخت مخالف تھا۔ اس کا خیال یہ نہ تھا کہ ایک انسان کا رنگ اسے اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ دوسرے انسان سے اس کے رنگ کی بناء پر وہ کوئی چیز چوری کر لے۔ وہ غریبوں اور کسانوں کا دوست تھا اور اس نے بچوں، عورتوں اور جانوروں کو ان لوگوں کے ظلموں سے ہمیشہ بچایا جنہیں اپنے ہمسایوں سے اتنی ہی محبت کا دعویٰ تھا جتنا وہ خود اپنے سے کرتے ہیں۔

وہ اس چیز کو مہمل خیال کرتا تھا کہ خدا باپوں کو تو غرق کر دے اور پھر بچوں کے واسطے خود اپنی جان دیدے۔ اس کا یہ خیال ڈیڈ براٹ کے اس قول کے بالکل موافق تھا کہ "اگر عیسیٰ کو یہودیوں سے بچنے کی قدرت تھی اور پھر بھی اپنے کو نہ بچایا تو وہ خودکشی کے مجرم تھے۔"

والٹیئر ظالموں سے نفرت کرتا تھا اور حکومتوں اور پادریوں کے مظلوموں سے محبت۔ وہ بدقسمتوں کا دوست اور فاقہ کشوں کا مددگار تھا وہ فطری چیزوں کا معتقد اور مہملات کا دشمن تھا۔

والٹیئر کوئی ولی نہ تھا مگر مذہبی جھگڑوں پر وہ ہنستا تھا، عقائد پر اسے رحم آتا تھا اور متعصبوں کی حرکات پر تنفر ——— وہ ولیوں سے بڑھ کر تھا!

والٹیئر کے زمانہ میں اکثر عیسائی اپنی روزمرہ کی زندگی میں مذہب کی پیروی نہیں کرتے تھے بلکہ جس طرح طوفان کے وقت جہازوں میں جان بچانے والی کشتیوں سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح مصیبت کے وقت مذہب سے وہ لوگ بھی کام نکالنا چاہتے تھے۔ والٹیئر انسانیت اور اعمال حسنہ کے مذہب کا معتقد تھا۔ صدیوں تک پادریوں نے معائب اور برائیوں کو ایسے رنگ میں رنگا تھا کہ گناہ بھی خوبصورت نظر آتا تھا مگر والٹیئر خوبی کے محاسن اور اوہام پرستی کے معائب کا معلم تھا۔

والٹیئر اپنے عہد کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار یا شاعر نہ تھا مگر وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا انسان، حریت کا سب سے بڑا دوست اور وہم پرستی

کا سب سے بڑا دشمن ضرور تھا۔ اُس نے اوہام پرستی کی زنجیروں کو توڑنے، دل و دماغ سے خوف کے بادل دور کرنے، پادریوں کے اختیارات ختم کرنے اور دُنیا کو آزادی دلانے کے لئے ابنائے آدم میں سے سب سے زیادہ کام کیا۔ اور صحیح معنیٰ میں وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا مذہب پرست تھا۔

واپسی — ۲۸ برس جلاوطن رہنے کے بعد والٹیر پیرس واپس ہوا۔ اس دوران میں مہذب دنیا میں وہ نہایت اعلیٰ پوزیشن کا مالک رہا اور اُس کی واپسی ایک فاتحانہ شان رکھتی تھی اُس کا ایک شہنشاہ کی طرح سے استقبال کیا گیا۔ اکاڈمی نے اُس کا خیر مقدم کیا جو عزت بادشاہوں کو بھی کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ تھیسٹر میں اس کا تماشہ "آئرین" دکھلایا گیا اور وہاں اُس کو پھولوں سے لاد دیا گیا۔ وہ فرانس کا بہترین شاعر مانا جانے لگا۔ دنیا کے تمام ادیبوں میں اس کا درجہ سب سے بلند تھا۔ اور اُس وقت فرانس میں صرف تین قوتیں سمجھی جاتی تھیں، تخت شاہی، قربانگاہ اور والٹیر!

بادشاہ اُس کا مخالف تھا۔ پادری اُس سے جلے ہوئے تھے مگر والٹیر کا عوام پر اتنا اثر ہو چکا تھا کہ وہ اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس وقت اس کی عمر ۸۴ برس کی تھی۔ اُس کے چار طرف سیم و زر کے انبار لگے تھے وہ دنیا کا نہایت دولت مند انشا پرداز تھا۔ وہ ایک ایسا بادشاہ تھا جس نے خود اپنا تخت بنایا تھا۔

مئی ۱۷۷۸ء میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ والٹیر مرنے کے قریب ہے۔

مرنے سے دو روز قبل والٹیر کا بھتیجا اس کے بستر مرگ پر دو مشہور پادریوں کو لے آیا۔ ایک پادری نے اُس سے آ کر پوچھا کہ کیا تم اب بھی حضرت یسوع مسیح کی الوہیت کا اقرار کرتے ہو۔ والٹیر نے دوسری طرف مُنہ کر کے جواب دیا کہ "مجھے اطمینان سے مرنے دو۔" پادری صاحبان منفعل ہو کر باہر چلے گئے!

۳۰ مئی ۱۷۷۸ء کو رات کے تقریباً سوا گیارہ بجے والٹیر اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ مرنے سے کچھ لمحے قبل اُس نے اپنے معتمد آدمی موراند کا جو پاس ہی کھڑا تھا ہاتھ دبایا اور کہا — "رخصت، مائی ڈیر موراند۔ میں چلا!"

اس کی اس موت کو جو اسقدر سادہ، سنجیدہ، فلسفیانہ، نازک، فطری اور پُرسکون تھی اور اس کے ان الفاظ کو جو اتنے ہی سادے اور معصومانہ تھے عجیب و غریب رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مرتے وقت اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا اور عذاب خداوندی اس پر نازل ہو رہا تھا۔

لیکن آئیے ذرا ایمانداری سے یورپ کے پادریوں اور یورپ کے مشہور منکرین کا مقابلہ کریں۔ کیا اٹلی کے تمام پادریوں نے برونو سے زیادہ انسانی عقل میں اضافہ کیا ہے؟ کیا فرانس کے تمام پادریوں نے والٹیر یا ڈیڈیراٹ سے زیادہ دنیا کو مہذب بنایا ہے؟ کیا اسکاٹلینڈ کے تمام پادریوں نے ہیوم سے زیادہ علم کی اشاعت کی ہے؟ کیا دنیا کے پادریوں نے ٹامس پین سے زیادہ انسانی آزادی کے لئے کوشش کی ہے؟

سوال یہ ہے کہ اگر یہ "ملحدین" نہ ہوتے تو دنیا کیا ہوتی؟ — "ملحدین" ہمیشہ بہادر اور خوش فکر ہوئے ہیں، گلشن عالم میں ان کی حیثیت گلاب کی سی رہی ہے، وہ آزادی اور محبت کے علمبردار تھے۔ اور ان کی ہستیاں عظیم المرتبت روحوں کی مالک تھیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لوگ جنہوں نے ابنائے آدم کی آزادی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہو۔ ان کو تو مرتے وقت ضمیر کے سانپ ڈسنے لگیں، اور وہ نفوس مقدسہ جنہوں نے غلامی کی تائید کی ہو، جنہوں نے ماؤں کی چھاتیوں سے ان کے معصوم بچوں کو چھین لیا ہو، جنہوں نے غلاموں کی ننگی پیٹھوں کو کوڑوں سے لہولہان کر دیا ہو وہ مرتے ہی فرشتوں کی آغوش میں چلے جائیں! ہم یہ کیونکر یقین کر سکتے ہیں کہ دنیا کے مفکرین و محققین، آزاد خیال، انسانیت پرست، تعصب کی زنجیروں کے توڑنے والے، علم کی روشنی پھیلانے والے اور اوہام پرستی کے بُت کو توڑنے والے تو تکلیف کی موت مریں اور وہ لوگ جو انسانی پوست کو ہڈی سے جدا کیا کرتے تھے، جو دودھ پلانے والی ماؤں اور بچوں کو مول لے کر زد و کوب کیا کرتے تھے وہ سب امن اور سکون کے عالم میں اس دنیا سے گزر جائیں

اُس زمانہ میں فلسفیوں اور منکرین کے لاشوں کو بھی زیر زمین دفن کرنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ کیونکہ خطرہ یہ تھا کہ ان لوگوں کی ہڈیاں نیک لوگوں کی ہڈیوں میں مل کر ان کو ناپاک بنا دے گی اور ممکن ہے کہ قیامت کے روز گڑبڑ میں یہ خراب لوگ بھی نیکوں کے ساتھ مل کر جنت میں چپکے سے گھس جائیں لہٰذا

جب کوئی فلسفی مرتا تھا تو اس کی لاش جلادی جاتی تھی یا اسے درندوں کے سامنے ڈال دیا جاتا تھا اور یا کسی ایسی جگہ دفن کرنے کی اجازت ملتی تھی جہاں آس پاس نیکوں کے مزار نہ ہوں۔

جب والٹیر کا انتقال ہوا تو ایک پادری نے پیرس سے سو میل کے فاصلہ پر ایک گرجا میں اُسے دفن کرنے کا انتظام کر دیا۔ مئی کے آخری روز اتوار کے دن اس کی لاش کو ڈریسنگ گاؤن اُڑھا کے چھ گھوڑوں کی ایک گاڑی پر رکھا گیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ کوئی بڑا آدمی کہیں جا رہا ہے اس گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی تھی جس میں اس کے دو تین اعزہ تھے۔ رات بھر سفر کرنے کے بعد لاش اس گرجا میں پہونچی اور والٹیر کو دفن کر دیا گیا مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد اُس پادری کے پاس جس نے "بہ نظر ترحم" زمین کا ایک ٹکڑا دے دیا تھا، بڑے پادری کی طرف سے ایک عتاب نامہ پہنچا کہ والٹیر کو دفن نہ کرنے دیا جائے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔

ہر چند والٹیر مر چکا تھا مگر قصر شاہی کی بنیادیں منہدم ہو چلی تھیں عوام بادشاہوں اور پادریوں کی کرتوتوں سے واقف ہو چکے تھے۔ اور انتقام وظلم کے عفریت کی جگہ اب امن و آزادی کے فرشتے لے رہے تھے۔

اگر "چرچ" کے اصول کو صحیح سمجھا جائے تو ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بجز "ملحدین" کے اور تمام مجرم مقابلۃً زیادہ سکون سے ہیں۔ اگر کوئی شخص ڈاکو ہے تو اس کی موت سے اس کے پیشہ کا کوئی تعلق نہیں، اگر کسی قاتل کے پاس مرتے وقت ایک پادری موجود ہے تو جنت میں نیک بندے اسکا استقبال کرنے کے لئے کھڑے ہوں گے۔ جس شخص نے دنیا میں اپنے گھر کو دوزخ بنا لیا تھا وہ بھی بغیر کسی جھجھک کے مر سکتا ہے بشرطیکہ اُس نے عیسیٰ کی الوہیت پر کبھی نہ شک کیا ہو۔ وہ بادشاہ جس نے ناحق لڑائیاں لڑکر ملک کو یتیموں اور بیواؤں اور اپاہجوں اور محتاجوں سے بھر دیا ہو وہ ایک ولی اللہ کی طرح جان دیتا ہے۔ عیسیٰ پر ایمان رکھنے والے جتنے بادشاہ ہیں وہ جنت میں ہیں مگر جتنے فلسفی ہیں وہ دوزخ میں۔ وہ ظالم جن کے نام ہی ان کے مظالم کی شہادت کیلئے کافی ہیں نیک بندوں کی موتیں مرے ہیں کیونکہ ان کا بپتسمہ ہو گیا تھا اور انہوں نے عیسیٰ کی الوہیت سے انکار نہیں کیا تھا۔ لوگوں میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا گیا تھا کہ اگر بادشاہ اور پادری بے گناہوں کو بھی زندہ جلا ڈالیں تو اُس وقت تک خدا ان سے باز پرس نہ کرے گا جب تک وہ اس کو مانتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ایماندار اور صداقت پرست نے "الہامی الفاظ" پر شک کیا یا کسی دوسرے خدا سے دعا مانگ لی تو حقیقی خدا ایک زخم خوردہ شیر کی طرح اپنے شکار پر چڑھ بیٹھے گا اور اس کے مرتعش جسم سے اس کی روح کھینچ لے گا۔

دنیا میں اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے کہ قتل کے لئے اٹھا ہوا ہاتھ مفلوج ہو گیا ہو، دُنیا میں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ کسی بے گناہ بچہ کو خدا نے عین موقع پر بچا لیا ہو۔ ہزاروں گناہ روزانہ کئے جاتے ہیں، سیکڑوں انسان اپنے شکار کی تلاش میں لگے رہتے ہیں بیواؤں کو کوڑے لگائے جاتے ہیں اور لوگ مارتے مارتے ان کی جانیں لے لیتے ہیں، چھوٹے بچے اپنے خونخوار باپوں سے رحم کی بھیک مانگتے ہیں مگر ان کی درخواستوں اور ان کی التجاؤں کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ حسین اور معصوم لڑکیوں کو دام تزویر میں پھانس کر ان کی عزت برباد کر دی جاتی ہے مگر خدا ان مظالم کو نہیں روکتا۔ پھر دنیا میں کبھی کبھی ذی فہم ایماندار انسان بھی پیدا ہوئے جو اپنے زمانہ کی اوہام پرستیوں کو دور کرنا چاہتے تھے۔ مگر پادریوں کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ تھا اور اس لئے ان پر مقدمے چلائے جاتے تھے اور ان کو سخت سے سخت سزا دی جاتی تھی۔ اگر اتفاق سے کوئی اپنی طبعی موت سے مرا تو پادری کہا کرتے کہ وہ نہایت سختی کی موت مرا ہے۔

پادریوں نے یہ ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے کہ ملحدین کے آخری لمحات نہایت تکلیف وہ گزرے ہیں اور اس کی تلقین گرجا کے ہر ممبر سے کی جاتی ہے مگر اس کو تسلیم کرنے کے بجائے والٹیر نے انجیل کی جانچ کی۔ عقلی آزادی کی وکالت کی، استبداد پسند مذہب کی زنجیروں کو توڑا، مظالم کے خلاف آواز بلند کی، عقل اور دلائل کے نام پر اپیل کی، عالمگیر رواداری پر زور دیا اور مظلوموں کی امداد کی۔

اس نے صرف یہ کہا کہ ہر مذہب کی اصل ایک ہی ہے ـــ ہر مذہب میں وہی اسرار ہیں، وہی معجزے وہی کرامات، وہی خرق عادات، وہی بندر،

وہی مراسم، وہی وعدے، وہی دھمکیاں، وہی مظالم اور وہی جور و تعدی۔

والٹیر کے یہی جرائم تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کے لئے یہ کیونکر کہا جا سکتا تھا کہ اس نے سکون کے عالم میں اپنی جان دی۔ چنانچہ صدیوں سے اہل مذہب یہی تعلیم دیتے چلے آرہے ہیں کہ جن لوگوں نے ہمارے مذہب کی تعلیمات پر لبیک نہیں کہا ہے اور اس کی کورانہ تقلید نہیں کی مرتے وقت ان کو ہمیشہ تکلیف ہی رہی۔ جب کوئی پادری حالت نزع کو بیان کرنے لگتا ہے تو اس کی فصاحت و بلاغت انتہا کو پہونچ جاتی ہے اور وہ جب ایک مرتے ہوئے ملحد کی آخری حالت بیان کرتا ہے تو اس کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ اور جب اس پر بھی اطمینان نہیں ہوتا تو عذاب جہنم کی داستانیں سنائی جاتی ہیں۔

دوسری واپسی — چار سو برس تک بیسٹائل، مظالم کا مرکز بنا رہا۔ اس کی چہار دیواری میں سیکڑوں شریف انسان موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ اس کے قید خانے اور اس کے آلات تعذیب خدا کے وجود سے انکار کر رہے تھے۔ مگر ۱۴ جولائی ۱۷۸۹ء کو مظلوم عوام نے بیسٹائل پر حملہ کر کے اُسے فتح کر لیا۔ ان کا نعرہ والٹیر تھا!

۱۷۹۱ء میں اس کی اجازت ملی کہ والٹیر اب یہاں دفن کیا جا سکتا ہے۔ وہ پیرس سے ۱۱۰ میل پر خاموشی سے دفن کر دیا گیا تھا مگر اب اُسے پوری قوم یہاں لا رہی تھی۔ جنازہ کا جلوس ۱۰۰ میل لمبا تھا۔ ہر گاؤں اپنا جھنڈا لئے جنازہ کے ساتھ تھا اور ہر شخص فرانس کے فلسفی، جین کلاس کے بچانے والے اور اوہام پرستی کے برباد کرنے والے کے حضور میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے بیتاب تھا۔

اگر واقعی موت کے بعد کوئی زندگی ہے تو کوئی خدا اُس شخص کو سزا نہیں دے سکتا جس نے اُن ظالمانہ سزاؤں کو مٹایا ہے اور اُس شخص کو کبھی نہیں رد کر سکتا جس نے غلامی کی زنجیروں کو یہاں توڑا ہے۔

والٹیر فرانسیسی زبان کا زبردست ماہر تھا اور ہر خیال کے لئے بہتر سے بہتر الفاظ ڈھونڈھ لیتا تھا۔ اہم سے اہم اور دقیق سے دقیق مسئلہ پر وہ نہایت آسانی سے لکھتا تھا۔ ہجو اور مدح پر ایسا قادر تھا کہ ایک ہی جملہ میں دونوں چیزیں آجاتی تھیں۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات اور اہم سے اہم مسائل کو اس طرح پیش کرتا تھا جیسے کوئی بازیگر اپنے گیند کا تماشہ دکھاتا ہے۔ وہ رموز دنیا سے واقف تھا۔ ظلم سے نفرت کرتا تھا، مظلوموں کا ساتھ دیتا تھا، اوہام پرستی کا دشمن تھا اور آزادی کا عاشق۔ یہ تھا والٹیر جس نے سترہ برس کی عمر میں اوڈی پس (Œdipe) لکھا اور ۸۳ برس کے سن میں آئرین Irene۔

آلپس کے دامن میں اپنے تخت جلال سے اُس نے یورپ کے ہر ریاکار پر انگشت نمائی کی اور نصف صدی تک وہ عقل کی شمع دنیا کو دکھاتا رہا۔ +

تین اہم کتابیں!

تدریس اُردو اردو تدریس پر فرمان فتحپوری کی عالمانہ تصنیف جو زبان کی تعلیم و تدریس کے جدید ترین اصول و قواعد اور تازہ ترین قومی مسائل کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ ... قیمت چار روپے

اُردو رباعی فرمان فتحپوری کا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ جس میں اردو فارسی ادب کی تاریخ میں پہلی بار رباعی کے فن، موضوع، اور ارتقا پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ... قیمت پانچ روپے

تحقیق و تنقید تحقیقی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ جس میں فرمان فتحپوری نے زبان و ادب کے نہایت اہم اور نئے موضوعات و مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ قیمت چار روپے

میر دردؔ کی ایک خصوصیت

امجد کندیانی

خواجہ میر دردؔ کی صوفیانہ زندگی نے اُن کی شاعری پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے کہ اُن کے کلام کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں رہ سکا۔ متصوفانہ مضامین سے قطع نظر اُن کی عملی زندگی، اُن کے افعال و اشغال اور اُن کے مزاج کے اثرات بھی اُن کے کلام میں جابجا نظر آتے ہیں۔ دردؔ کی زندگی کا اہم ترین حصہ یعنی لڑکپن کے بعد سے لے کر تادمِ آخر درویشی میں گزرا۔ اس عمر میں اُنھوں نے تصوف کا وسیع مطالعہ بھی کیا اور فارسی نثر میں اس موضوع پر بعض قابلِ قدر کتابیں بھی لکھیں۔

اس میدان میں چونکہ مشاہدے اور نظارۂ حسنِ دوست پر بہت زور دیا جاتا ہے، اس لئے دردؔ کے ذہن میں بھی یہ بات رس بس گئی اور اُن کے کلام میں بھی بعض اوقات شعوری اور بعض اوقات غیر شعوری طور پر منتقل ہو گئی۔ مشاہدے، دیکھنے دکھانے اور چشم، نظر، نگاہ اور دیدہ وغیرہ سے متعلق اتنے مضامین اُن کے مختصر سے دیوان میں ہیں کہ غالباً دوسرے کسی موضوع پر اِن کے نصف کے برابر بھی نہ ہوں گے۔ مشاہدے کا مضمون اُن کے کلام پر چھایا ہوا ہے۔ اگر ایسے مضامین کا تجزیہ کیا جائے اور اُن کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو اُس کے پس منظر میں وہی نفسیاتی وجوہات کارفرما نظر آئیں گی جو اُن کی صوفیانہ زندگی سے عبارت تھیں۔

خواجہ میر دردؔ کے نزدیک بحیثیت ایک صوفی کے زندگی کا تمام تر مقصد فقط حسنِ دوست کا مشاہدہ کرنا ہے۔ اُس کو پا لینے یا حاصل کرنے وغیرہ کا تصور تک بھی نہیں ملتا۔ فرماتے ہیں ؎

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا | برابر ہے دُنیا کو دیکھا نہ دیکھا

یعنی زندگی کا واحد مقصد تو حسنِ ازل کو یہاں جلوہ فرما دیکھنا تھا اور اگر انسان سے یہی نہ ہو سکے تو پھر بڑی سے بڑی سرگرم عمل زندگی بیکار اور عبث ہے ؎

منظور زندگی سے تیرا ہی دیکھنا تھا | ملتا نہیں جو تو ہی پھر کیا ہے زندگانی

پوری انسانی زندگی کو یوں فقط مشاہدے سے وابستہ کر دینا تصوف ہی کا معجزہ ہے۔ دردؔ کا فلسفہ یہ ہے کہ زندگی کا واحد مقصد حسنِ دوست کو دیکھنا ہی۔ اس کی راہ دکھانے والا دل ہے اور دل کے آئنہ کو صاف کر لینے کے بعد وہ کائنات کے گوشے گوشے میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ منزلِ آخر ہے جس کی خاطر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ عام صوفیاء کی طرح اُن کے کلام میں اُلجھے ہوئے، پیچیدہ اور مجہول خیالات نہیں ملتے۔ دل اُن کے طریقِ عشق میں رہنما ہے ؎

آئینے کی طرح غافل کھول چھاتی کے کواڑ | کب تلک غلطاں رہیگا آب اور دانے کے بیچ

آپ اور دانے کی زندگی کو تج کر اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا لینے کی دعوت دیتے ہیں اور زندگی کا مقصد ہی نظارۂ حسن ہے ؎

اے دردؔ! کر ٹک آئنہ دل کو صاف تو
پھر ہر طرف نظارۂ حسن و جمال کر

اسی عظیم مقصد کی بنا پر زندگی بھی عظیم ہے اور اس کا ایک ایک سانس دمِ عیسیٰ ہے ؎

بے فائدہ انفاس کو ضائع نہ کر اے دردؔ
ہر دم دمِ عیسیٰ ہے، تجھے پاس نہیں ہے

دردؔ زندگی کو تمام تر مشاہدہ سمجھتے ہیں اور انسان کا اوّلیں فرض مشاہدہ قرار دیتے ہیں ؎

فرصتِ زندگی غنیمت ہے
مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے،

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

اُٹھتی جوانیوں میں کھیتوں کو پانی دے لینے کا سبق نہیں بلکہ دُنیا کی سیر کرنے کی تلقین ہے۔ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۔ اور جھٹلانے والوں کی عاقبت دیکھنے کے علاوہ ؎

دردؔ اس کی بھی دید کر لیجئے
نوجوانی یہ مفت جاتی ہے

دردؔ کے فلسفہ کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ وہ دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ پانے یا حاصل کرنے کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کا نفسیاتی سبب یہ ہے کہ وہ وحدت الوجود کی بجائے وحدت الشہود کے قائل تھے۔ اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ نے فرمایا ہے کہ مآلِ قولین یک ست لیکن پھر بھی دونوں فلسفوں کے طریقِ کار اور دونوں فلسفوں کی APPROACH مختلف ہے۔ دردؔ کے کلام میں جہاں یہ موضوع زیر بحث آیا ہے وہاں دیکھنے دکھانے، دید، مشاہدہ، نظارہ وغیرہ کا ذکر ضرور ہمراہ آیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وحدت الشہود کے قائل تھے۔ اس بات کا خارجی ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی نثری تصنیف علم الکتاب میں لکھتے ہیں:۔

"وحدت الوجود کا عقیدہ نفس کے اعتبار سے باطل ہے اور وحدتِ شہود کا عقیدہ حق ہے۔ لیکن کیفیت اور حال کے اعتبار سے دونوں کا مقصود ایک ہی ہے یعنی قلب کا ماسوا کی گرفتاری سے آزاد کرنا۔" (ترجمہ از صـ ۱۸۴)

اسی عقیدے کا اظہار وہ غزل میں کرتے ہیں ؎

عین کثرت میں دید وحدت ہے
قید میں دردؔ با فراغ ہوں میں

نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

آئنہ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر
ہے موجزن تمام یہ دریا حباب میں

اس آخری شعر میں عقیدہ وحدۃ الوجود کی توضیح کردی ہے کہ وجود کے ایک ہونے سے یہ مراد نہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ خدا کی ذات کا حصہ ہے اور انسان بھی خدا ہے بلکہ یہ ہے کہ حقیقت میں جس شے کا وجود ہے وہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ باقی جتنے وجود نظر آتے ہیں یہ اعتباری ہیں۔ انکی حقیقت "نیستی" ہے۔ ان کو فنا لازم ہے اور یہ نیستی سے ہستی میں آئے ہیں۔ اس لئے خدا کے سوا جتنے وجود نظر آتے ہیں یہ حقیقی نہیں۔ حقیقی وجود صرف ایک ہے اور وہ خدا کا ہے۔ گویا اس عقیدہ سے ماسوا اللہ کی ذات کا انکار مراد ہے۔ نہ کہ اُن کو بھی ذاتِ الٰہی میں شامل کرنا۔ مذکورہ بالا شعر میں کہا ہے کہ آئنہ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر یعنی ممکنات جن کی حقیقت عدمِ محض ہے مثلِ آئنہ ہیں جن میں ہستی کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ یا مثالِ حباب ہیں جس میں دریا موجزن دکھائی دیتا ہے۔ وجود دراصل وجودِ باری ہے۔ امکان تو سراپا افتقار ہے۔ اس کے لئے وجود کہاں ؎

یاں افتقار کا تو اِمکاں سبب ہوا ہے — ہم ہوں نہ ہوں ولے ہے ہونا ضرور تیرا

اب یہ دیکھنے والی آنکھ پر منحصر ہے کہ وہ وجودِ اعتباری کو درمیان سے پردے کی طرح اُٹھا کر وجودِ حقیقی کو دیکھ لے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر میر دردؔ نے بار بار چشمِ بصیرت کی عظمت کو سراہا ہے ؎

گر معرفت کا چشمِ بصیرت میں نور ہے — تو جس طرف کو دیکھئے اُس کا ظہور ہے

حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم، — کھُلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

جوں خواب ہر وابستہ بغفلت یہ تماشا — کھُل جائے اگر آنکھ تو پھر کیا نظر آوے

اب اوّل سے آخر تک دیکھئے تو دیکھنا' دیکھنا اور فقط دیکھنا کی تکرار ہے۔ زندگی کا مقصد دیکھنا ہے۔ زندگی کی اصل فقط دیکھنا ہے۔ انسان کو دیکھنے والی آنکھ پیدا کرنی چاہیئے۔ جہاں میں حُسنِ ازل کی تجلیات کو دیکھنا سب سے بڑی سعادت ہے اور حد یہ کہ دنیا کا وجود اسی جذبہ کا مرہونِ منت ہے ؎

اس ہستیٔ خراب سے کیا کام تھا ہمیں — اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

یہ دیکھنے کا مضمون جو میر دردؔ کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے، اُن کے کلام پر بھی محیط ہے۔ اسی سبب اُن کے کلام میں چشم، دیدہ، نگاہ وغیرہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ایسی چیزوں کا ذکر بے حد زیادہ ہے جن کا تعلق دیکھنے سے ہے۔ مثلاً صورت، نقش، نشان، تصویر، مظاہر، پنہاں، عیاں، سایہ، چھاؤں، مختلف رنگ جن میں بعض زیادہ نمایاں ہیں، تجلّی، جلوہ، پردہ، عیب پوش، ڈھانکنا، چھپانا وغیرہ جیسے الفاظ کی اُن کے دیوان میں بھرمار ہے۔ حالت یہ ہے کہ اُن کی تمام غزلیات جو تقریباً بارہ سو اشعار پر مشتمل ہیں، اُن میں تین سو کے لگ بھگ اشعار فقط انہی مضامین سے متعلق ہیں۔ کئی غزلوں کی ردیف "دیکھنا" ہے۔ بے شمار غزلیات از اوّل تا آخر، اسی موضوع کی حامل ہیں اور چشم تو اپنی بنیادی اہمیت کی وجہ سے علامتی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ تصوف کے بیان میں اگرچہ اصطلاحات اور تلمیحات زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں لیکن دردؔ نے علامات بھی وضع کیں۔ لیکن دیگر شعراء کے برعکس ان کی علامات میں ایک عجیب و غریب انفرادیت ہے اور وہ یہ کہ اُن کی علامات میں ایک ارتقائی تسلسل ہے۔ یعنی اسی چشم کو مختلف علامتی حیثیتیں دے دیتے ہیں اور پھر اُن میں ایک ارتقائی ربط قائم کر دیتے ہیں۔ جس کی بنا پر ہم اُسے ایک ہی علامت کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

چشم سے وہ بعض جگہ یہی عام چشم مراد لیتے ہیں۔ دوسری جگہ اسے انسانی دل سے تعبیر کرتے ہیں اور مراد چشمِ بصیرت لیتے ہیں۔ پھر آخر میں یہی چشم پورے انسان کا مفہوم ادا کرتی ہے۔ پہلی منزل پر اس کا مطلب عام انسانی آنکھ ہے ؎

پھرتی ہے میری خاک صبا در بدر لئے — اے چشمِ اشکبار یہ کیا تجھ کو ہوگیا

وہ اشک نکلتا ہے مری چشم سے جس کا — ہر قطرہ کم از پارۂ الماس نہیں ہے

دوسری حیثیت چشمِ دل کی ہے جس کا مفہوم چشمِ بصیرت ہے ؎

نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر — جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

حجابِ رُخِ یار تھے آپ ہی ہم — کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

پھر چشم سے مراد انسان ہے ؎

سراپا چشم ہوں جوں آئنہ پر، — کسو پر دردؔ میری کب نظر ہے

چشمِ نقشِ قدم ہوں جوں بیکس — خاک آنکھوں میں ملو دیا ہے مجھے

اس ارتقائی کیفیت کی نفسیاتی توجیہہ یہ ہے کہ دردؔ چونکہ ایک صوفی تھے اور اس حیثیت سے سلوک اور تصوف کے مختلف مقامات

ور مراحل طے کرتے ہوئے ایک ارتقائی کیفیت سے آشنا تھے۔ اس لئے غیر شعوری طور پر اسی چیز نے اُن کے کلام کو یوں متاثر کیا۔ یہ ارتقاء صرف چشم ہی میں نہیں بلکہ اُن کی دیگر علامات یعنی غنچہ اور آئنہ وغیرہ میں بھی ہے۔ اور چونکہ چشم کا تعلق اپنی خصوصیت دید کی وجہ سے آئنہ کے ساتھ زیادہ ہے، اس لئے بعض جگہ ان کا باہم ذکر بھی آیا ہے۔ مشاہدے اور چشم کی اتنی زیادہ اہمیت کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ان کے کلام میں جو رسمی اور عام شاعرانہ مضامین ملتے ہیں جن میں تصوف یا درد کی انفرادیت کو دخل نہیں اُن میں سب سے زیادہ تعداد ایسے اشعار کی ہے جن میں چشم یا متعلقاتِ چشم مثلاً ابرو، بھویں، پلکیں، خارِ مژہ، ترچھی نگاہ، نگہِ گرم، نظرِ کرم، شرابِ چشم وغیرہ کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کا اثر مواد پر بھی ہوا اور اسلوب پر بھی۔ ان کی تشبیہات تمام تر بصری اور مشاہداتی ہیں اور تجلی، رنگ، نقش وغیرہ کے مضامین کثرت سے ہیں۔ مجازی محبوب کا جہاں کہیں ذکر ہے اُس میں بھی محبوب کی صفات کا بصری پہلو زیادہ نمایاں کیا ہے۔ اس کی آنکھ، مژہ، نگہ گرم وغیرہ کا ذکر د اذکار ہے۔ سوال وجواب آنکھوں میں ہوتے ہیں اور انتہا یہ ہے کہ مجازی محبوب کو درد صرف دیکھنا چاہتے ہیں ؎

درد کے ملنے سے اے یار بُرا کیوں مانا　　اُس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

کبھو ہم کو بھی بھلا کوچوں میں،　　چلتے پھرتے نظر آجایئے گا،

مجازی محبوب کا ذکر ہر جگہ اور ہمیشہ دیکھنے کا مضمون ساتھ لے کر آیا ہے۔ لمس احساس قطعاً نہیں جیسا کہ جرأت کے یہاں ملتا ہے یا پھر میر کے محبوب کی خصوصیات میں جو دلفریب تنوع ہے وہ درد کے یہاں نہیں ہے۔ اُن کے ہاں تنزیہی پہلو زیادہ اُجاگر ہوتا ہے اور اسی نے مجازی موضوعات میں بھی رنگینی پیدا نہیں ہونے دی۔ اس کا سبب یہی ہے کہ درد کی تمام تر زندگی فقط مشاہدے میں گزری۔ زندگی کے وہ اعمال وافعال جن سے ایک عام انسان گزرتا ہے درد کی شخصیت میں دخیل نہ ہو سکے۔ وہ زندگی سے دور ہٹ کر ایک کُنجِ عافیت میں دیکھنے دکھانے کے شغل میں مصروف رہے۔ اُن کے مُریدین بھی یہی آرزو دل میں لے کر آتے تھے اور اُن کا اپنا بھی یہی فلسفہ تھا۔ اس سے قطع نظر کہ یہ فلسفہ زندگی آموز ہے یا فرار کی راہ دکھانے والا، اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے اُن کے کلام میں مشاہداتی عنصر نمایاں ہو گیا۔ ایک انسان کی زندگی میں جتنی خالص بصری چیزیں ہو سکتی ہیں کم وبیش اُن سب کا ذکر ہے لیکن دیگر حواس کے مدرکات کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے اور اس نے یقیناً اُن کے مضامین کے تنوع کو مجروح کیا۔ تاہم اسی موضوع نے ان کی غزل کو گہرائی بخشی اور اُنکے متصوفانہ مضامین کے اظہار کیلئے سہولتیں پیدا کیں۔

ان توضیحات سے اتنی بات تو معلوم ہو گئی کہ درد کے کلام میں مشاہدے کا مقام تقریباً مرکزی حیثیت رکھتا ہے مگر لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَار کی قرآنی نص اور لن ترانی کا ارشاد گرامی اس بات پر شاہد ہیں کہ دنیا میں رویتِ باری انسانی بس کی بات نہیں۔ مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں جگہ جگہ یہ فقرہ آتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ وَرَاءُ الْوَرَاء ثُمَّ وَرَاءُ الْوَرَاء۔ اور یہی مسلک خواجہ میر دردؔ کا بھی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کھولی تھی آنکھ خوابِ عدم سے ترے لئے　　آخر کو جاگ جاگ کے ناچار ہو گئے

مثلِ شرر تنگ چشم ہستیٔ بے بود ہے،　　دیکھ نہ سکا اُسے تک بھی جدھر دیکھا

دید کے لئے ایک وقت معین ہے۔ شاید وہاں مشاہدے کے آلات اور قویٰ میں تبدیلی کر دی جائے یا کوئی اور صورت ہو — بہر کیف اہل حال اِس عالمِ کون وفساد کو عالمِ انتظار سمجھتے ہیں اور اُس عالمِ جاوداں کو عالمِ دید ونظارہ — اس انتظار کا تذکرہ میر درد نے کتنے مؤثر انداز میں کیا ہے ؎

اتنا پیغام درد کا کہیو،　　گر صبا کوئے یار میں گزرے

کون سی رات آن ملئے گا!　　دن بہت انتظار میں گزرے

طنزیاتِ فارسی کے بعض نوادر

نیاز فتحپوری

طنزیہ شاعری سے کوئی زبان خالی نہیں۔ اُردو میں بھی اسکی مثالیں بہ کثرت نظر آتی ہیں، لیکن اس قدر لطیف و نادر نہیں، جتنی فارسی ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(۱) ایک بار خواجہ نصیر کو کسی امیر نے کافر کہہ دیا۔ اس الزام کے جواب میں اس نے دو شعر کا قطعہ لکھا:۔

نظام بے نظام ار کافرم خواند — چراغ کذب را نبود فروغے
مسلماں خوانمش زیرا کہ نبود — سزاوارِ دروغے جز دروغے

یعنی ایک بدتمیز امیر نے مجھے کافر کہا۔ خیر۔ لیکن میں تو اسے مسلمان ہی کہوں گا۔ کیونکہ جھوٹ کا جواب جھوٹ ہی ہوا کرتا ہے۔

(۲) شہاب ترشیزی ایک شخص کی ہجو میں لکھتا ہے:۔

زبہرِ تاختن در وادیِ ہجو — سمندِ طبع را چوں رام کردم
ترا خر خواندم و گشتم پشیماں — کہ آں بیچارہ را بدنام کردم

یعنی میں نے تیری ہجو میں جل کر تجھے خر (گدھا) کہدیا۔ لیکن اب پشیمان ہوں کیونکہ اس طرح میں نے تجھ سے نسبت دے کر خواہ مخواہ گدھے کو بدنام کیا۔

(۳) ایک بار مولانا جامی کو کسی شاعر نے اپنی ایک غزل سُنائی جو بالکل مہمل تھی لیکن یہ خصوصیت اس میں ضرور پائی جاتی تھی کہ حرف (الف) کا استعمال اس میں کہیں نظر نہ آتا تھا اور اسی التزام کی طرف اس نے جامی کو زیادہ توجہ دلائی۔ مولانا جامی نے اس غزل کی داد میں جو کچھ کہا وہ سُننے کے لائق ہے:۔

شاعرے خواند پُر خلل غزلے — کیں بہ حذفِ الف بود موصوف
گفتمش نیست صنعتے بہ ازاں — کہ کنی حذف ازاں تمام حروف

یعنی کتنا اچھا ہوتا، اگر شاعر اپنی غزل میں الف کے ساتھ سبھی حُروف حذف کر دیتا ہے

(۴) تاج الدین سرخسی نے ایک ظالم شخص کی موت پر ایک رباعی لکھی:۔

در ماتمت آں قوم کہ خوں می بارند — مرگ تو حیاتِ خویش می پندارند
غمناک ازانند کہ تا دوزخیاں — جاوید چگونہ باتو صحبت دارند

یعنی تیرے ماتم میں جو لوگ خون کے آنسو بہا رہے ہیں، سو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ تیرے مرنے کا انہیں افسوس ہے کیونکہ تیری موت تو دراصل قوم کی حیات ہے، بلکہ غم اس بات کا ہے کہ غریب دوزخی کیونکر تیرے ساتھ دائمی زندگی بسر کرسکیں گے۔

(۵) مولانا شہاب الدین، ایک طبیب سے جس کا نام اصیل تھا خفا ہو گئے اور یہ قطعہ اس کی ہجو میں تصنیف کیا۔

ملک الموت از اصیل طبیب، | می بالید بدرگاہِ خدائے
بازاں شغل دُور کن اورا | یا مرا خدمتِ دگر فرمائے

نی فرشتہ موت خدا کے حضور میں رو رو کر عرض کر رہا تھا کہ اصیل طبیب نے تو دنیا خالی کرنے پر کمر باندھ رکھی ہے اس لئے میری کیا ضرورت ہے، اگر تو اس طبیب کے لئے دوسرا پیشہ تجویز نہیں کر سکتا تو مجھی کو کوئی اور خدمت عطا فرما۔

) کاتبی نیشاپوری کو کسی امیر کی طرف سے کوئی سالانہ امداد ملتی تھی لیکن وہ اتنی کم تھی کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا اس نے ایکبار جھلا کر یہ شکایت لکھ بھیجی۔

خسروا از خورد و پوشش من نداری آگہی | چون نباشد ہر دم از تو نالہ و افغاں مرا
نیستم کعبہ کہ در سالے دہی یک جامہ ام | یا مہینم گردوں کہ روزے بس بود یک ناں مرا

نی تو جو میرے کھانے پہننے کی طرف سے غافل ہے تو اس کی شکایت کیوں نہ کروں۔ میں کوئی کعبہ تو ہوں نہیں کہ سال میں صرف ایک لباس میرے لئے فی ہو اور نہ آسمان ہوں کہ صرف ایک روٹی (یعنی آفتاب) پر قناعت کروں۔

) کمال الدین اسمٰعیل کو کسی رئیس نے گھوڑا انعام میں دیا لیکن شاعر کے پاس کیا تھا کہ وہ گھوڑے کو کھلاتا۔ خود اسی پر اسباب معیشت تنگ تھے س واقعہ کا اظہار وہ اس طرح کرتا ہے:-

دی اسپ مرا گفت کہ دریں چہ شک ست | کاصطبل تو از زاویہ ہائے فلک ست
نے آب و داں، نہ سبزہ نہ کاہ نہ جو | ایں جائے ستور نیست جائے ملک ست

نی کل میرے گھوڑے نے مجھ سے کہا کہ تیرا اصطبل اس دنیا کی چیز تو ہے نہیں، ممکن ہے کوئی آسمانی چیز ہو۔ نہ اس میں پانی ہے، نہ گھاس نہ جو۔ اس لئے ری جگہ یہاں کسی فرشتہ کو لاکر باندھ۔ میرا یہاں کوئی کام نہیں۔

) اسیری نے ایک بخیل امیر کے دسترخوان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

ترا اے خواجہ کتر اماک بر خواں | زنعمہائے الواں ہیچ اثر نیست
چو مہر بر نطع گردوں سفرت را | شب از گردہ ناں بیشتر نیست
دلے ہر کو شکست آں گردہ ناں | اگرچہ دانم آں حد بشر نیست
کند گر دعوئے اعجاز شاید | کہ ایں معجز کم از شق القمر نیست

یعنی اے خواجہ تیرا دسترخوان آسمان سے کم نہیں، کہ وہاں بھی ایک ہی روٹی چاند کی ہے اور یہاں بھی ایک۔ اس لئے اگر کوئی شخص رے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکے (جس کا بظاہر کوئی امکان نہیں) تو اس کا دعوائے اعجاز غلط نہ ہوگا کیونکہ اس کا تیرے دسترخوان پر روٹی ڑنا گویا چاند کے دو ٹکڑے کرنا ہوگا۔

(۵) عبد العلی طوسی ایک رباعی میں کسی بخیل کا ذکر کرتا ہے۔

اے کاسۂ تو سیاہ، دیگ تو سفید | از آتش و آب ہر دو، ببریدہ امید
آں شستہ نمی شود مگر در باراں | ویں گرم نمی شود مگر در خورشید

یعنی تیرا سیاہ پیالہ اور سفید دیگ دونوں آگ اور پانی سے بے نیاز ہیں کیونکہ تیرا پیالہ اگر کبھی دُھلتا ہے تو صرف بارش کے پانی ے' اور اگر دیگ کبھی گرم ہوتی ہے تو صرف دھوپ میں۔

(جنگ)

عہد مغلیہ کا عسکری و مالی نظام

نیاز فتحپوری

مغلوں کی حکومت یکسر فوجی حکومت تھی اور سول و ملٹری کی جو تقسیم اس وقت نظر آتی ہے وہ ان کے دور سلطنت میں نہ تھی۔ گویا یوں سمجھئے کہ ایک قسم کا مارشل لا جاری تھا۔ حکومت کی آمدنی کا بڑا حصہ فوج ہی پر صرف ہوتا تھا اور جملہ نظم و نسق فوج ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس امر کا اندازہ کہ عسکری قوت کے لئے کتنا اہتمام کیا جاتا تھا سپاہ کی اس تعداد سے ہو سکتا ہے جس سے وہ حملہ و دفاع میں کام لیتے تھے۔

بابر نے جس وقت ہندوستان پر حملہ کر کے ابراہیم لودی کو پانی پت میں شکست دی ہے تو پوری ایک لاکھ کی جمعیت اس کے ساتھ تھی، جس میں دس ہزار سوار اور باقی پیادہ فوج اور توپخانہ کے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نہ ذرائع آمد و رفت وسیع تھے اور نہ خبر رسانی کے وسائل کثیر، اس لئے ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فوج کی فراہمی، اس کی نقل و حرکت اور رسد رسانی میں کتنی زحمت اور کتنی دولت صرف ہوتی ہوگی۔

اکبر سے قبل چونکہ کوئی منظم حکومت مغلوں کی قائم نہ ہوئی تھی اس لئے ان سے یہ توقع بھی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ کوئی مستقل باقاعدہ عسکری تنظیم کر سکتے تھے، لیکن جب اکبر تخت نشین ہوا اور مغلوں کے قدم مضبوطی سے ہندوستان میں جم گئے اس وقت البتہ عسکری تنظیم عمل میں آئی اور اس وسعت کے ساتھ کہ سارا ملک فوجی حکومت کے سپرد کر دیا گیا۔ اگر آپ اس وقت کے عہدہ داروں کے منصب پر غور کریں گے تو حیرت ہوگی کہ گورنر سے لیکر دربار کے مسخرے تک سب فوجی منصب رکھتے تھے۔

صوبہ کے گورنر کو سپہ سالار کہتے تھے اور پرگنہ کے حاکم کو فوجدار، علاوہ ان کے دوسرے درباریوں اور عہدہ داروں کی تعیین منصب بھی ان سواروں کی حیثیت سے ہوتی تھی جو ان کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ ابوالفضل جو بادشاہ کا کاتب خصوصی تھا اور لڑنے بھڑنے کی خدمت اس کے سپرد نہ تھی، اپنے عہدہ کے لحاظ سے ۲۵۰۰ سواروں کا منصب دار تھا اور بیربر جو صرف مسخرہ شاعر کی حیثیت رکھتا تھا وہ بھی ایکہزار سواروں کا افسر تھا۔ سید محمد میر عدل قاضی تھے لیکن ۹۰۰ سواروں کا اہتمام ان کے بھی سپرد تھا اور فیضی جس کا کام صرف شاعری کرنا تھا، ۴۰۰ سواروں کا کمانڈر تھا۔

سواروں کے کمانڈروں کو منصب دار کہا کرتے تھے، لیکن ان میں بھی فرق مراتب پایا جاتا تھا۔ ۵۰۰ سے لیکر ۲۵۰۰ سواروں تک کے منصب داروں کو امیر کہتے تھے اور اس سے زیادہ کے منصب دار کو امیر کبیر۔

امراء کا علاوہ اس فوجی کے ایک منصب ذاتی بھی ہوا کرتا تھا، یعنی اگر کوئی پانچ ہزار سواروں کا منصب دار تھا تو اس کے معنے یہ تھے کہ رکھتا تھا وہ صرف ۴۰۰۰ سوار لیکن فوجی منصب کے لحاظ سے وہ پنجہزاری کہلاتا تھا۔ شاہجہاں نے تو یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ منصب داروں کو مقررہ تعداد کے ایک تہائی سے زیادہ سوار رکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور بعض صورتوں میں صرف ایک چوتھائی کافی سمجھا گیا۔

اکبر کے زمانہ میں (شاہزادوں کو چھوڑ کر) یہ فوجی منصب کم سے کم دس سوار اور زیادہ سے زیادہ پانچہزار سواروں تک محدود تھا۔

لیکن دو تین امیروں کو شش ہزاری و ہفت ہزاری منصب بھی عطا ہوا تھا۔

اُمراء کا مشاہرہ، منصب کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتا تھا یعنی ہفت ہزاری سے لیکر یک صدہ تک، تین لاکھ پچاس ہزار روپیہ تا چار ہزار روپیہ سالانہ (موجودہ سکہ کے حساب سے) ان امراء کا مشاہرہ جن کے تین درجے[1] مقرر تھے اس طرح مقرر ہوتا تھا کہ پنجہزاری درجۂ اول کو دو لاکھ پچاس ہزار، درجۂ دوم کو ۲۴۲۵۰۰ اور درجۂ سوم کو ۲۳۵۰۰۰ روپیہ سالانہ۔

یہ مشاہرے ذاتی منصب سے متعلق ہوتے تھے تاکہ امراء اپنے اپنے صوبوں، نیز دربار میں اپنی حیثیت کو قائم رکھ سکیں اور اپنے ذاتی مصارف پورے کرسکیں۔ شاہی خدمت کے لئے سواروں کی جتنی تعداد وہ رکھتے تھے اس کا الاؤنس علیحدہ ملتا تھا۔

سوار اپنے گھوڑوں کی نگہداشت اسلحہ کی فراہمی اور نقل و حرکت کے خود ذمہ دار ہوتے تھے۔ ان کے بھی تین درجے تھے۔ تین گھوڑے والے، دو گھوڑے والے اور ایک گھوڑے والے۔ اول و دوم درجہ کا مشاہرہ پچیس روپیہ ماہوار اور درجۂ سوم کا ساڑھے سولہ روپیہ ماہوار۔ بعد میں دکن کے سواروں کا مشاہرہ کچھ بڑھا دیا گیا تھا۔

وہ سوار جو خود اپنے گھوڑے نہیں رکھ سکتے تھے انہیں بارگیر کہتے تھے اور ان سواروں کے خادم سمجھے جاتے تھے جو انہیں گھوڑے فراہم کرتے تھے۔

اوّل اوّل اُمراء یا منصب داروں کا مشاہرہ نقد مقرر نہ تھا بلکہ جاگیروں کی صورت میں ہوا کرتا تھا، لیکن ۱۵۷۴ء میں شہنشاہ اکبر نے تمام جاگیریں خالصہ میں شامل کر کے تمام منصب داروں کا مشاہرہ نقد مقرر کر دیا۔ اس سے اُمراء میں بہت برہمی پیدا ہوگئی اور بنگال، گجرات اور سندھ کے اُمراء کی جاگیریں پھر بحال کر دی گئیں، قرب و جوار کے صوبوں میں البتہ وہی نقد کا دستور قائم ہوگیا۔

اکبر نے ایک اصلاح اور کی وہ یہ کہ منصب دار اپنے گھوڑوں کو داغ کرائیں تاکہ پتہ چل سکے کہ وہ مقررہ تعداد گھوڑوں کی رکھتے بھی ہیں یا نہیں۔ یہ طریقہ اوّل اوّل ایران و ماوراء النہر کے عہد سلجوقی میں رائج ہوا تھا جسے ۱۳۱۲ء میں علاء الدین خلجی نے بھی جاری کیا تھا، لیکن بعد کو اسکی پابندی قائم نہ رہی اور پھر دو صدی بعد ۱۵۴۱ء میں شیر شاہ نے دوبارہ قائم کیا۔ شیر شاہ کے مرنے پر یہ رواج موقوف ہوگیا تھا، لیکن اکبر نے پھر اسے جاری کیا۔ اس سے یہ مقصود تھا کہ منصب دار واقعی اتنے سوار رکھنے پر مجبور کیے جائیں جتنے از روئے منصب و مشاہرہ ان کو رکھنے چاہئیں۔ اس کی بھی سخت مخالفت ہوئی اور آخر کار پنجہزاری اُمراء کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ کرنا پڑا، اور عہد مغلیہ کے آخر میں سبھی مستثنیٰ ہوگئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوار کی حقیقی تعداد کچھ ہوتی تھی اور کاغذات میں کچھ اندراج ہوتا تھا، چنانچہ ۱۷۵۰ء میں بنگال کا ایک امیر ۱۰۰۰ سواروں کا منصب رکھتا تھا، لیکن ان کی تعداد ستر، اسّی سے زیادہ نہ تھی۔

شہزادوں اور منصب داروں کی فوج کے علاوہ خود بادشاہ کی بھی ذاتی فوج ہوا کرتی تھی جسے والاشاہی کہتے تھے۔ اس فوج میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے تھے جو کمسنی ہی سے (بہ حالت شہزادگی) فرمانروا کی ذات سے وابستہ ہوتے تھے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں اس باڈی گارڈ کی تعداد چار ہزار تھی، ان کے مشاہرہ کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں نہیں ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ منصب داروں کے سواروں سے انھیں زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔

اکبر نے ایک فوج احدیوں کی بھی قائم کی تھی۔ اور احدی کہنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ انفرادی طور پر ذات شاہانہ سے وابستہ ہوتے تھے۔ اس وقت اُردو زبان میں احدی کا لفظ کاہل انسان کے لئے استعمال ہوتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً ان احدیوں کو دوسرے سواروں کے

---

[1] وہ امرا جن کا ذاتی منصب فوجی منصب کے برابر ہوتا تھا درجۂ اوّل کے امراء کہلاتے تھے۔ وہ جن کا فوجی منصب ذاتی منصب کا نصف ہوتا تھا درجۂ دوم میں شمار ہوتے تھے اور وہ جن کا فوجی منصب بہ نسبت ذاتی منصب کے نصف سے بھی کم ہوتا تھا۔ درجۂ سوم کے امیر کہلاتے تھے۔

مقابلہ میں زیادہ آرام ملتا تھا اور وہ رفتہ رفتہ کاہل ہو جاتے تھے۔ احدیوں کا درجہ منصب داروں سے کم اور عام سواروں سے زیادہ سمجھا جاتا تھا۔

سواروں کے علاوہ پیادہ فوج بھی رکھی جاتی تھی جس میں دربان، چوکیدار، ہرکارے، پالکی بردار سبھی شامل تھے۔ لیکن وہ سپاہی جو جنگ کے لئے مخصوص تھے انہیں برق انداز، تیر انداز اور نیزہ بردار کہتے تھے۔

اکبر کے زمانہ میں برق انداز (بندوق چلانے والے) بارہ ہزار کی تعداد میں تھے جن کے ہر دستہ کے افسر کو "داروغہ" کہتے تھے۔ ان کی تنخواہوں کا حساب و کتاب بالکل علیحدہ رہتا تھا۔ ادنیٰ حیثیت کے افسران چار درجے رکھتے تھے۔ درجۂ اول والے کو ساڑھے سات روپیہ، دوسرے درجہ والے کو سات روپیہ، تیسرے درجہ کے افسر کو پونے سات اور چوتھے درجہ والے کو ساڑھے چھ روپیہ ماہوار ملتے تھے۔

اس وقت ایک فوج اور بھی تھی جسے "داخلی" کہتے تھے۔ اس میں ایک چوتھائی برق انداز ہوتے تھے اور تین چوتھائی تیر انداز۔ یہ وہ فوج تھی جو پرگنہ کے فوجداروں کے پاس رہتی تھی تاکہ قیام امن و سکون و وصولی مالیانہ میں وقت ضرورت اس سے کام لیا جائے۔ تیر انداز بہ نسبت برق اندازوں کے زیادہ خیال کئے جاتے تھے۔ کیونکہ برق انداز جب تک اپنی بندوق بھرے یہ متعدد تیر سر کر سکتا تھا۔ جنگ کے وقت سواروں کا مقابلہ پیادہ فوج سے نہیں بلکہ سواروں ہی سے کیا جاتا تھا اور یہ حقیقت بہت بعد کو معلوم ہوئی کہ اصل اہمیت پیادہ فوج ہی کو حاصل ہے۔

توپ خانہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک وزنی دوسرا ہلکا۔ بابر کے زمانہ میں توپخانہ بہت اچھا تھا اور اس میں کام کرنے والے زیادہ تر، ترک اور نو مسلم پرتگالی ہوا کرتے تھے۔ ہلکی توپیں بیل گاڑیوں پر لادی جاتی تھیں اور ان سے بھی زیادہ ہلکی (جنہیں زمبورک کہتے تھے) اونٹوں پر ہوتی تھیں۔ بھاری توپوں کو لیجانے کے لئے کئی کئی بیل جوتے جاتے تھے اور کبھی کبھی یہ کام ہاتھیوں سے بھی لیا جاتا تھا۔ پھر جوں جوں عسکری انتظام خراب ہوتا گیا، بھاری توپوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ بسا اوقات ان کا لیجانا مشکل ہوتا تھا۔ گولے، ٹھوس لوہے اور پتھر کے ہوا کرتے تھے، بعض اوقات ان میں تانبے کے پیسے بھر کر داغتے تھے۔ توپخانہ کا افسر اعلیٰ میر آتش کے نام سے موسوم ہوتا تھا۔ سو برق اندازوں کے افسر کو صدی وال کہتے تھے اور دس برق اندازوں کے افسر کو میر دہا۔ اکبر جنگ کے وقت ہاتھیوں سے بہت کام لیتا تھا۔ اور انہیں پر سوار ہو کر تیر انداز اور برق انداز جنگ کرتے تھے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ بسا اوقات ہاتھی خود اپنی ہی فوج کو زیادہ نقصان پہنچا دیتے ہیں اس لئے ان کا استعمال ترک کر دیا گیا اور ان سے صرف سواری کا کام لیا جانے لگا۔

اکبر کا دستور تھا کہ جب وہ ہاتھی پر بیٹھ کر جنگ کرتا تو اس کے چاروں طرف دس، بیس بلکہ تیس ہاتھی اور ہوتے تھے۔ شاہی ہاتھی خاصہ کہلاتا تھا اور دوسرے ہاتھی حلقہ۔ اکبر کے بعد بھی یہ تفریق بدستور قائم رہی۔ لیکن مفہوم کے لحاظ سے اتنا فرق ہو گیا کہ سواری کے تمام ہاتھی خاصہ کہلائے جانے لگے اور بار برداری کے ہاتھی حلقہ۔

ہفت ہزاری منصب داروں سے لیکر پانصدی منصب داروں تک کے لئے قاعدہ مقرر تھا کہ وہ ایک ہاتھی سواری کے لئے اور پانچ ہاتھی بار برداری کے لئے ہر ڈھائی ہزار کے منصب کے حساب سے ضرور اپنے پاس رکھیں۔ یہ ہاتھی بادشاہ کی ملکیت ہوا کرتے تھے اور سوائے جنگ کے منصب داروں کے استعمال میں کبھی نہ آتے تھے۔

فوج کا سپہ سالار خود بادشاہ ہوا کرتا تھا، لیکن عام انتظام "بخشی الممالک" کے سپرد ہوتا تھا، اس کی ماتحتی میں علاوہ متعدد کلرکوں کے (جنہیں تیکچی کہتے تھے) تین بخشی بھی ہوا کرتے تھے۔ فوجی بھرتی، سپاہیوں کی گنتی، منصب داروں اور سواروں کی تنخواہ وغیرہ کا حساب، سب اسی محکمہ کے سپرد تھا۔ سال میں دو مرتبہ فوجوں کا معائنہ ہوا کرتا تھا اور میر بخشی دیکھتا تھا کہ منصب داری کے گھوڑے داغی اور قابل استعمال ہیں یا نہیں۔ جو گھوڑے بیکار سمجھے جاتے تھے ان کو علیحدہ کر کے دوسرے گھوڑے رکھنے کا حکم دیا جاتا تھا۔

والاشاہی یا شاہی باڈی گارڈ کا انتظام سوائے ایک میر بخشی کے کسی اور کے سپرد نہیں کیا گیا۔ اسی طرح احدیوں کا میر بخشی علیحدہ ہوا کرتا تھا جس کا انتخاب اونچے درجہ کے امراء سے کیا جاتا تھا۔ جب میر بخشی کسی کو احدیوں میں بھرتی کرتا تھا تو واقعہ نگار اس کا نام درج کر کے ایک سند اس کو دیتا تھا جو وزیر کے سامنے پیش کی جاتی تھی ــــ صوبہ داریوں میں بھی فوج کا نظام وہاں کے میر بخشیوں کے سپرد تھا۔

اکبر کے زمانہ میں کُل تعداد افواج کیا تھی۔ اس کا اندازہ مشکل ہے کیونکہ اُمراء کے فوجی منصب کی تعیین کہیں سے ظاہر نہیں ہوتی کہا جاتا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں بارہ ہزار برق انداز تھے اور اگر بلاک مین کے بیان کو صحیح سمجھا جائے تو کُل سپاہ ۲۵ ہزار ثابت ہوتی ہے؛ لیکن یہ بیان درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جب ہمایوں ایک لاکھ سوار میدان جنگ میں لے آتا تھا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اکبر نے اس میں اضافہ نہ کیا ہو اور توسیع سلطنت کے لئے زیادہ فوج کی ضرورت نہ ہوئی ہو۔ بلاک مین نے یہ تعداد غالباً صرف شاہی باڈی گارڈ کی ظاہر کی ہے ــــ شاہجہاں کے آخری نصف دَور میں مناصب کے لحاظ سے ۲۵۵۰۰۰ کی جمعیت ہونی چاہیئے تھی، لیکن کسی منصب دار نے کبھی مقررہ تعداد فوج کی نہیں رکھی اور اس لئے حسب اندراج "بادشاہ نامہ" اعداد و شمار یہ تھے:۔

منصب دار ۸۰۰۰ ــ احدی اور سوار برق انداز ۲۰۰۰۰ ــ (فوجداروں کے پاس جو سپاہ وصول مالیانہ وغیرہ کے لئے رہتی تھی اس سے علیحدہ تھی) ــــ پیادہ برق انداز، تیر انداز ۴۰۰۰۰ ــــ (ان میں سے دس ہزار سپاہی ہیڈکوارٹر میں رہتے تھے اور دس ہزار قلعوں اور صوبوں میں)

اورنگ زیب کے زمانہ میں پچاس ہزار سوار رزرو میں رہتے تھے اور تقریباً اتنے ہی اِدھر اُدھر نقل و حرکت کرتے رہتے تھے۔ سواروں کے علاوہ بیس ہزار پیادہ فوج خالص راجپوتوں کی تھی۔ ان میں بارہ ہزار توپ خانے کے لئے وقف تھے، اور باقی شاہی حفاظت کے لئے ــــ عہد مغلیہ میں فوج کی باقاعدہ قواعد کا رواج نہ تھا اور نہ صف بندی کے خاص اصول مقرر تھے، بخشی کے معائنہ کے وقت ایک کے پیچھے ایک سامنے سے گزر جاتے تھے، جب بادشاہ شکار کے لئے جاتا تھا تو البتہ فوج بھی ہانکے میں شریک ہوتی تھی اور یہی ان کی فوجی قواعد تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ سپاہی مگدر اور لیزم ہلا کر ورزش کرتا رہتا تھا اور فنون سپہ گری کی مشق بھی جاری رکھتا تھا۔

مغل حکومت کا انحصار صرف کاشت پر تھا۔ معدنیات میں لوہا اور تانبا ضرور میسّر آ جاتا تھا لیکن کافی مصارف کے بعد، کوئلہ کا وجود بالکل نہ تھا ــ چونا، نمک اور شورہ بیشک پایا جاتا تھا اور عمارتی پتھر بھی ــ

قابل کاشت رقبہ کو دیہ (گاؤں) کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اور متعدد گاؤں کا رقبہ پرگنہ یا محال کہلاتا تھا، اکثر گاؤں کاشتکاروں کے قبضہ میں تھے جو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور ہر خاندان جداگانہ رقبہ میں کاشت کرتا تھا ــ کاشتکاروں کے ان تمام مختلف خاندانوں کا تعلق مقدم سے ہوا کرتا تھا جو مالگزاری دینے کا ذمہ دار ہوتا تھا اور گاؤں کا تمام انتظام کرتا تھا ــــ کاشت زیادہ تر غلہ کی ہوتی تھی، ترکاری اور نیشکر بھی بوتے تھے لیکن کم، روغنی تخم کی کاشت بھی صرف ضرورت کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ افیون زیادہ کی جاتی تھی اور تماکو کا رواج بہت وسیع ہو گیا تھا۔ روئی، سن، اور نیل خاص صنعتی پیداواریں تھیں۔ ہر کاشتکار کے پاس بہت مختصر سا رقبہ ہوا کرتا تھا جسے وہ خود اپنی محنت اور اپنے خاندان کی مدد سے کاشت کرتا تھا۔ کھیت جوتنے کا کام بیلوں سے لیا جاتا تھا اور چونکہ کوئی مرکزی سرمایہ کاشتکاری کا نہ تھا اس لئے ہر کاشتکار مجبور ہوتا تھا کہ وہ ہر فصل پر جلد سے جلد اپنی پیداوار کو فروخت کر دے ــــ صنعتیں مختلف و متعدد تھیں، ان میں پارچہ بافی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ سوتی کپڑے عام طور پر ہر جگہ طیار کیئے جاتے تھے اور زیادہ تر ملک ہی کے اندر استعمال ہوتے تھے، اعلیٰ قسم کا کپڑا بعض مقامات سے البتہ کپڑا باہر بھی جاتا تھا، لیکن ململ اور چھپے ہوئے کپڑے زیادہ تر خشکی کے راستہ سے باہر جاتے تھے۔ جن بازاروں میں اس کپڑے کی مانگ تھی وہ بہت قدامت پرست تھے اور سوائے خاص نمونوں کے کوئی اور کپڑا استعمال نہ کرتے تھے۔

اس لئے ایجاد و اختراع کا کوئی موقعہ نہ تھا۔

ریشمی کپڑا زیادہ تر بنگال و گجرات میں تیار ہوتا تھا اور صرف مقامی ضروریات کے لحاظ سے، جوٹ اور سَن بھی صرف مقامی اہمیت رکھتے تھے لیکن سترھویں صدی میں سَن کے بورے وغیرہ باہر جانے لگے تھے۔

ملک کے ان حصوں میں جہاں امن و امان رہتا تھا تجارت خاصی ترقی پر تھی اور ایک منظم صورت رکھتی تھی۔ ہنڈیوں کے ذریعہ سے لین دین جاری تھا نہ صرف ملک کے اندر بلکہ بعض بیرونی ممالک میں بھی۔

باہر سے جو سوداگر آتے تھے وہ مال کی زیادہ مقدار لیجانا پسند نہ کرتے تھے بلکہ اپنے روپیہ کو دس بارہ فیصدی سود پر تقسیم کر دیتے تھے۔ بیرون ملک کے لئے خشکی کے دو راستے براہ کابل و قندھار مقرر تھے، تبت کا راستہ بھی کھلا ہوا تھا لیکن اس سے بہت کم فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ بحری راستے کے ذریعہ سے گجرات کا تعلق بحر احمر، خلیج فارس، مشرقی افریقہ، سماترا اور ملاکا وغیرہ سے بھی تھا۔ سندھ کا تجارتی تعلق ایران سے تھا۔ لیکن زیادہ وسیع پیمانہ پر نہیں۔ بنگال کا کاروباری تعلق زیادہ جنوبی ہند، برما اور سیام سے تھا۔

سولھویں صدی میں تمام بحری راستوں پر پرتگالیوں کا اقتدار قائم تھا جو زیادہ تر ساحل کارومنڈل سے (جہاں مغلوں کا قبضہ نہ تھا) براز اور مغربی افریقہ کے لئے کپڑا لیجاتے تھے۔ جب ۱۶۱۱ء میں انگریزوں نے اور ۱۶۱۶ء میں ڈچ نے اپنی فیکٹریاں سورت میں قائم کیں تو چھینٹ[1] اور نیل مغربی یورپ کو زیادہ مقدار میں جانے لگا۔ سترھویں صدی کے وسط میں نیل کی تجارت گر گئی کیونکہ ہندوستان ویسٹ انڈیز کا مقابلہ نہ کر سکا اور ادھر ۱۶۳۰ء کے قحط کی وجہ سے گجرات کی آبادی کم ہوگئی جس سے چھینٹ کی تجارت مشرقی ساحل کی طرف زیادہ وسیع ہوگئی ــ اسی صدی میں جب انگریزوں اور ڈچ نے اپنی فیکٹریاں ہوگلی پر قائم کیں تو ریشم، شورہ، ململ اور چھینٹ کی مانگ بہت بڑھ گئی جسے بنگال اور مدراس سے پورا کیا جاتا تھا۔

غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے تجارتی تعلقات کا مخصوص نقطۂ نظر سونے چاندی کی درآمد تھی۔ ہندوستان والے خود زیادہ چیزیں باہر کی نہ خریدتے تھے بلکہ زیادہ تر اس کے خواہشمند رہتے تھے کہ وہ اپنی چیزیں فروخت کرکے نقد حاصل کریں۔ پھر چونکہ مغربی یورپ ہندوستان کی اس خواہش کو پورا نہ کر سکتا تھا اس لئے تجارتی کمپنیاں اس کوشش میں رہتی تھیں کہ دوسرے ملکوں سے چاندی سونا کھینچ کر لاتے رہیں، چنانچہ چین سے چاندی اور جاپان سے سونا فراہم کرکے یہاں لایا جاتا تھا۔ اندرون ملک کے ذرائع نقل و حرکت بہت ناکافی و نامکمل تھے۔ ہر چند اٹک، گنگا، جمنا اور بنگال کے دریاؤں کے ذریعہ سے مال بہ کثرت ادھر ادھر جاتا تھا، لیکن اتنے وسیع ملک کے لئے یہ محدود وسائل کہاں تک کام دے سکتے تھے۔ مجبوراً خشکی کے راستے اختیار کرنے پڑتے تھے جو ناہموار اور غیر محفوظ اور تکلیف دہ تھے۔ سڑکیں بہت کم تھیں اور تھیں بھی تو بالکل خام۔ اکثر تو صرف پگڈنڈی کی صورت میں تھیں اور سوائے اس علامت کے کہ اس کے دو رویہ درختوں کی قطار ہوتی تھی، کوئی اور نشان اسکے گزرگاہ ہونے کا نہ پایا جاتا تھا۔ راستے میں جا بجا کارواں سرائے بنی ہوئی تھیں اور تجارتی قافلے یہیں قیام کرتے تھے۔

باربرداروں کے لئے زیادہ تر گاڑیاں، بیل اور اونٹ سے کام لیا جاتا تھا۔ آدمی گھوڑوں، پالکیوں یا اچھے بیلوں کی گاڑی میں سفر کرتے تھے۔ ڈاک کا انتظام اچھا تھا لیکن صرف سرکاری مراسلت کے لئے۔ عام لوگوں کو خود اپنے ذاتی ہرکارے رکھنا پڑتے تھے۔

معاشرت کا معیار عام طور پر بہت ادنیٰ تھا اور سوائے ان اُمراء کے جو ضرورت سے زیادہ پاتے تھے اور اسی طرح اسے خرچ کرتے تھے

[1] انگریزی میں اسے CALICO کہتے ہیں کیونکہ یہ کپڑا زیادہ تر کلکتہ میں تیار ہوتا تھا۔ ۱۲

تمام آبادی افلاس و تنگدستی میں مبتلا تھی۔

سلطنت کی خوشحالی کا انحصار تین چیزوں پر تھا۔ ایک بارش کا وقت پر ہونا، دوسرے امن و سکون کا قائم رہنا اور تیسرے انتظام مالگزاری۔ پھر چونکہ بارش کی طرف سے اکثر شکایت رہتی تھی اور ذرائع نقل و حرکت عام نہ ہونے کی وجہ سے قحط زدہ مقامات کو دوسری جگہ سے غلہ فراہم نہ ہو سکتا تھا اس لئے لوگ اِدھر اُدھر چلے جایا کرتے تھے اور کوئی مستقل آبادی نہ ہونے پاتی تھی۔ اگر بارش اچھی ہو جاتی تھی اور پیداوار کافی ہوتی تھی تو بھی خوش حالی کا کوئی امکان نہ تھا کیونکہ مرکزی منڈیاں موجود نہ تھیں جہاں زیادہ پیداوار کی کھپت ہو سکے، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کاشتکار مفلس و نادار رہتے تھے — ملکی و مالی نظام کی صورت یہ تھی کہ بادشاہ ان دونوں کا مالک و مختار سمجھا جاتا تھا اور اس کے چار مددگار ہوا کرتے تھے۔ ایک وکیل (وزیر اعظم) دوسرا وزیر (حاکم مال) تیسرا بخشی اور چوتھا صدر۔ وکیل کی جگہ ہمیشہ پُر نہ رہتی تھی اور اس کی خدمات بھی وزیر کے سپرد ہوتی تھیں بخشی کا حال آپ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ صدر کا کام شریعت کا نفاذ تھا۔

جس وقت مغلوں کی حکومت شمالی ہند میں قائم ہوئی تو یہاں کا نظام اچھا نہ تھا، ملک کے مختلف حصے مختلف سرداروں کے ہاتھ میں تھے اور وہی سیاہ و سفید کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ اکبر نے سلطنت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا جہاں کا ذمہ دار حاکم سپہ سالار یا صوبہ دار کہلاتا تھا۔ لیکن ۱۵۹۵ء کے بعد وصولی مالگذاری کا کام اس سے علیحدہ کر دیا گیا۔ علاوہ ان صوبہ داروں کے خاص خاص مقامات پر فوجدار بھی مقرر کیے گئے جو قلعہ بند مقامات میں قلعہ دار کی حیثیت بھی رکھتے تھے — شہر کا افسر کوتوال کہلاتا تھا جو پولیس، عدالت، میونسپلٹی اور محکمۂ احتساب کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ پولیس اس وقت نہ پائی جاتی تھی بلکہ اس کا کام فوج سے لیا جاتا تھا — یہ کہنا مشکل ہے کہ سلطنت کے ہر حصہ میں (خاص کر ان مقامات میں جہاں کی فوج داری ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی) یہی نظام قائم تھا، تاہم قیام امن ہر افسر کا فرض تھا اور سپہ سالار و فوجدار اس کے ذمہ دار قرار دیئے جاتے تھے۔

مالی انتظام یا دیوانی وزیر کے سپرد تھی اور وہ ذمہ دار تھا کہ دربار یا "حضور" سے جو احکام صادر ہوں انکی تعمیل کرے۔ ہر چند کچھ آمدنی کروڑ گیری، نمک ٹکسال، نذرانہ وغیرہ سے بھی ہوتی تھی لیکن بڑا ذریعہ آمدنی کا لگان ہی تھا — مسلمانوں کی آمد سے قبل ہر کاشتکار اپنی پیداوار کا خاص حصہ جیسے فرمانروا مقرر کر دیتا تھا لگان کی صورت سے حکومت کو دے دیا کرتا تھا، مسلمانوں نے اس قاعدہ کو باقاعدہ جاری رکھا اور زمین کی ملکیت بدستور کاشتکاروں کی قائم رہی — مغلوں کے زمانہ میں زمین کی دو قسمیں ہو گئیں۔ خالصہ یا دیوانی اور جاگیر۔ خاص خاص امراء کی جاگیریں خراج سے مستثنیٰ تھیں لیکن ایک خاص رقم خزانۂ شاہی میں جمع کرنا ان کا فرض تھا، چھوٹے چھوٹے اُمراء کی جاگیروں کی مالگزاری متعین تھی جن میں سے ایک حصہ وہ اپنے لئے مخصوص رکھتے تھے اور باقی حکومت کے خزانہ میں داخل کر دیتے تھے — ملک کے وہ حصے جو براہ راست حکومت کے زیر انتظام تھے انہیں خالصہ کہتے تھے۔ یہ حصے خزانۂ شاہی میں نقد داخل کرنے کے لئے مخصوص تھے اور وزیر کا عملہ اس کا انتظام کرتا تھا۔ اوّل اوّل یہ خدمت صوبہ دار کے سپرد تھی لیکن ۱۵۹۶ء میں ہر صوبہ میں ایک دیوان مقرر کیا گیا جو براہ راست وزارت سے واسطہ رکھتا تھا اور اسی وقت سے دیوانی اور فوجداری علیحدہ علیحدہ ہو گئی — وہ حصے جو خزانۂ شاہی سے وابستہ نہ تھے، جاگیروں میں منقسم تھے یعنی ہر وہ افسر جس کا کوئی مشاہرہ متعین تھا اسے اتنی ہی آمدنی کی جاگیر عطا کر دی جاتی تھی۔ ملک کا اکثر حصہ انہیں جاگیروں میں تقسیم تھا اور خالصہ یا دیوانی کے لئے ملک کا صرف چھٹا یا ساتواں حصہ رہ جاتا تھا۔

اکبر نے کاشتکار کی پیداوار کا تہائی حصہ بطور لگان کے مقرر کیا تھا لیکن سترھویں صدی میں یہ نصف حصہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی تعیین کے تین طریقے تھے:۔ (غلہ بخشی۔ پیمائشی۔ نسق) غلہ بخشی کی صورت میں فصل یا خرمن دیکھ کر ایک نظری تخمینہ پیداوار کا کر لیا جاتا تھا اور اس کے تہائی کی قیمت لگا کر نقد وصول کر لیا جاتا تھا۔ پیمائشی کی صورت میں ایک مقررہ رقم رقبۂ کاشت کے لحاظ سے متعین ہوتی تھی۔ ان دونوں صورتوں

میں لگان عام طور پر نقد ہی وصول کیا جاتا تھا، لیکن ان حصوں میں جہاں کرنسی کا رواج زیادہ نہ تھا غلہ کی صورت میں بھی لے لیا جاتا تھا۔ نسق کی صورت یہ ہوتی تھی کہ پورے گاؤں کی جمع بندی قائم کر کے مقدم یا مکھیا سے وصول کر لی جاتی تھی ۔ یہ امر کہ ان تینوں طریقوں میں کونسا طریقہ وصولی لگان جگہ عمل میں لایا جائے صرف بادشاہ کی مرضی پر منحصر تھا۔

جس وقت بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا ہے نسق کا طریقہ رائج تھا اور بابر نے بھی اسی کو قائم رکھا شیر شاہ نے پیمائشی طریقہ رائج کیا اور اوّل اوّل اکبر نے بھی اسی کو پسند کیا۔ ہر رقبہ کی مالگزاری اس کی پیداوار کا اندازہ کر کے ایک تہائی مقرر کر دی جاتی تھی اور کہیں نقد وصول کی جاتی تھی اور کہیں غلہ کی صورت میں، بعد کو اس کی دقتیں محسوس کر کے نقد مالگذاری (۴۰ دام فی روپیہ کے حساب سے) مقرر کر دی گئی ۔ مختلف زمینوں کی مختلف پیداوار کے لحاظ سے نرخ بھی چیزوں کا مقرر کیا گیا اور اکبر کے دورِ حکومت میں اسی کی پابندی رہی۔ لیکن جہانگیر کے زمانہ میں اس کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا اور نسق کی صورت اختیار کی گئی (جو اب تک جاری ہے) البتہ وہ رقبے جو زیادہ اُجاڑ تھے اور جہاں کے مقدم وصولی کی ذمہ داری نہ لے سکتے تھے وہاں غلہ بخشی یا پیمائشی طریقہ سے وصولی ہوتی تھی۔

شہروں میں عدالت و انصاف کا کام قاضی کے سپرد ہوتا تھا اور مفصلات میں یہ خدمت عمال کے سپرد تھی۔ جھگڑوں کی تحقیقات سرسری اور سزا سخت ہوتی تھی لیکن اسلامی شریعت کے مطابق کبھی سزائیں نہیں دی گئیں ۔

مقامی افسران، مقامی انتظام کے لئے ٹیکس کے ذریعہ سے بھی رقمیں وصول کیا کرتے تھے، اندرونی و بیرونی تجارت پر بھی زبردست ڈیوٹی لگائی جاتی تھی، اور ہر چند اکبر اور اورنگ زیب دونوں نے اس کی سخت ممانعت کر دی تھی، لیکن یہ دستور کسی نہ کسی صورت سے علیٰ حالہ قائم رہا۔

ٹکسال پر خاص توجہ کی جاتی تھی کیونکہ اس کی آمدنی بادشاہ کو ملتی تھی۔ سکے سونے، چاندی اور تانبے کے ڈھالے جاتے تھے لیکن چونکہ ان کی قیمت دھات ہونے کے لحاظ سے متعین ہوتی تھی اس لئے مبادلہ کا نرخ گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔ خاص سکہ، رائج الوقت چاندی کا روپیہ تھا جس میں ۱۸۰ گرین خالص چاندی ہوتی تھی۔ تانبہ کا سکہ دام کہلاتا تھا جس کا وزن ۳۲۴ گرین کا ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد چھوٹے چھوٹے سکے رائج تھے۔

اوزان میں من کا رواج تھا جو ملک کے مختلف حصوں میں مختلف حیثیت رکھتا تھا۔ جنوبی ہند میں وہ ۲۵ پونڈ وزن کا ہوتا تھا اور گجرات میں ۳۳ پونڈ کا (جو بعد کو ۱۶۳۵ء میں ۳۰ پونڈ کا کر دیا گیا) شمالی ہند میں اکبر کی تخت نشینی کے وقت اس کا وزن ۵۲ پونڈ کا تھا لیکن اکبر نے اسے ۵۵ پونڈ کا کر دیا، جہانگیر نے ۶۶ پونڈ اور شاہجہاں نے ۷۴ پونڈ۔ مغربی بنگال میں اس کا وزن ۴۸ پونڈ تھا اور مشرقی بنگال میں ۶۴ پونڈ۔

ناپ میں گز کا رواج تھا جو اکبر کے زمانہ میں ۳۳ انچ کا تھا اور بعد کو ۴۰ انچ کر دیا گیا۔ جنوب میں ذراع یا ہاتھ کی پیمائش رائج تھی، جس کی لمبائی ۱۸ انچ ہوتی تھی، لیکن گجرات میں ذراع ۲۶ انچ کا تھا اور بنگال میں ۲۰ انچ کا +

انتقادیات

مولانا نیاز فتحپوری کے معرکۃ الآرا ادبی تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ جن کی نظیر نہیں ملتی، ہر مقالہ اپنی جگہ حرف آخر اور معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے "اردو زبان" "اردو شاعری" "غزل گوئی کی رفتار ترقی" اور ہر بڑے شاعر کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اسی اہمیت کی بنا پر پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں داخل ہے۔ قیمت چار روپے ۵۰ پیسے۔

قربانی کی شرعی حیثیت

(رفیع اللہ۔ گوجر خاں)

قربانی کے متعلق آپ کے مختصر اشارات پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ حقیقت ہے کہ ہمارے سلف صالحین کا بالکل یہی مسلک تھا۔ لیکن قربانی سے ذاتی مقاصد کے لئے دلچسپی لینے والے حضرات نے قوم تک ان صالحین امت کا مسلک نہیں پہنچنے دیا۔ وقت ہے کہ ان کو اس سے آگاہ کیا جائے۔

قربانی کا مسئلہ آج کل عام دلچسپی کا موضوع بنا ہوا ہے۔ کچھ لوگ اس کا سرے سے انکار کر رہے ہیں تو کچھ لوگ اسے قرآن مجید سے ثابت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں خاصا افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عامۃ الناس اس مسئلہ کی صحیح شرعی حیثیت سے کماحقہ آگاہ نہیں ہیں۔ حق بات تک پہنچنے کے لئے لازمی ہے کہ امت اس مسئلے کی پوری تفصیل سے آگاہ ہو۔ اس مقصد کے لئے ہم اپنی طرف سے کچھ کمی یا زیادتی کئے بغیر نبی صلعم، صحابہ کرام اور ائمہ مجتہدین کا مسلک من وعن نقل کرتے ہیں۔

جو لوگ قربانی کو قرآن مجید سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان کی خدمت میں عرض ہے کہ تمام ائمہ مجتہدین کے نزدیک قربانی سنت ہے یعنی قرآن مجید میں قطعیت کے ساتھ یہ حکم کہیں نہیں آیا کہ حج کے دنوں میں مکہ شریف کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی تمام مسلمانوں کے لئے قربانی کرنا لازم ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں جو کچھ آیا ہے اسے حج کی قربانی سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے مقامات کی قربانی کا ثبوت احادیث سے ملتا ہے اس لئے یہ سنت کے درجہ میں ہے۔

فالاضحیة سنة عین موکدة یثاب فاعلها ولا یعاقب تارکها۔

(ترجمہ) قربانی سنت عین موکدہ ہے۔ کرنے والا مستحق ثواب ہے۔ اور تارک پر کوئی شرعی گرفت نہیں۔

(الفقه علی المذاهب الاربعة جلد ۱ صفحہ ۵۹۳)

قاضی ابو یوسف اور امام محمد کا بھی یہی مسلک ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک قربانی واجب ہے جن احادیث سے قربانی کا ثبوت مہیا کیا جاتا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:-

احادیث اور قربانی

(۱) عن ابی رملة عن مخنف بن سلیم اَنَّ رسول اللّٰہ صلعم قال بعرفة اِنَّ علی کل اھلِ بیتٍ فی کلِ عامٍ اَضحی۔ ابو رملة مخنف بن سلیم سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلعم نے میدانِ عرفات میں فرمایا کہ ہر گھر والے پر سال میں ایک مرتبہ قربانی ہے۔

(۲) عن حبیب بن مخنف عن ابیہٖ انہٗ سَمِعَ رسول اللّٰہ صلعم یقول بعرفة علی کل اھلِ بیتٍ اَنْ یذبحوا فی کل رجب شاةٌ وفی کل اَضحی شاةٌ۔

(ترجمہ) حبیب بن مخنف اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے نبی صلعم کو عرفات کے میدان میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہر گھر والوں پر ایک قربانی ماہ رجب میں اور ایک قربانی ذوالحجہ میں لازم ہے۔

(۳) عن الحسن انّ رسول اللّٰہ صلعم اَمَرَ بالاَضحیٰ۔

(ترجمہ) حسن سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے قربانی کرنے کا حکم دیا۔

(۴) عن ابن مسیب عن ابی ھریرة اَنَّ رسول اللّٰہ صلعم قَالَ مَنْ وَجَدَ سعةً فَلیضحِ۔

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ ہر خوش حال آدمی قربانی کرے۔

(۵) عن ابی ھریرة قال قال رسول اللّٰہ صلعم مَن وَجَدَ سَعَةً فلم یَضحِ فلا یقرب مصلانا۔

(ترجمہ) کہ جس شخص نے خوشحالی کے باوجود قربانی نہ کی تو وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے (یعنی وہ مسلمان نہیں ہے)
(المحلی جلد ۷ صفحہ ۳۵۷)

ان تمام احادیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ ان حدیث کی صحت مشکوک ہے وکل ھذا لیس بشیٍٔ (ایضاً) اور ان کے ضعف کی تفصیل یہ ہے۔

اَما حدیث مخنف فعن ابی رملة الغامدی، وحبیب بن مخنف وکلاھما مجھولٌ لایدری واما حدیث الحسن فمرسلٌ۔ واما حدیث ابی ھریرة فکلا طریقہٖ مِنْ روایة عبد اللّٰہِ بن عیاش ابن عباس القتبانی فلیس معروفاً بالثقةِ۔

(ترجمہ) مخنف کی دونوں احادیث یعنی ابو رملة الغامدی کی روایت سے اور حبیب بن مخنف کی روایت سے تو یہ دونوں مجہول الحال اور گمنام قسم کے راوی ہیں۔ حسن کی حدیث مرسل ہے اور ابوہریرہ کی دونوں احادیث ایک راوی عبداللہ بن عیاش ابن عباس القتبانی سے ہے جو غیر معتبر شخص ہے (المحلی جلد ۷ صفحہ ۳۵۷)

ان احادیث کے علاوہ کچھ اور احادیث بھی بیان کی جاتی ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ شریف میں قربانی فرمایا کرتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس مضمون کی حدیث کا آخری حصہ بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے یہ روایت مسند احمد میں ہے۔ اور علامہ شوکانی نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ روایت کے آخری حصہ کے الفاظ روایت کے راوی حضرت علی بن حسین کی زبانی سنئے:۔

فمکثنا سنین لیس لرجلٍ من بنی ھاشم یضحی قد کفاہ اللّٰہ المؤنة برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ

...یہ وسلم والزم رواہ احمد۔

...) ہم یعنی بنی ہاشم میں سے کوئی فرد بھی قربانی نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ لوگ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی قربانی کو سلے ...ہم کے لئے کافی سمجھتے تھے۔

(نیل الاوطار جلد ۵ صفحہ ۱۱۵)

دوسری روایت میں ہے کہ قربانی آپ کے لئے تو لازمی تھی لیکن امت کے لئے نہیں۔

ثَلٰثٌ کُتِبَ عَلَیَّ وَلَمْ تُکْتَبْ عَلَیْکُمْ اَلضُّحٰی وَالْاَضْحِیَۃِ وَالْوِتْر

...) تین چیزیں میرے لئے تو لازمی ہیں لیکن امت کے لئے نہیں۔ نماز چاشت، قربانی اور وتر۔

(تفسیر روح المعانی جلد ۳۰ صفحہ ۲۴۷)

قربانی دورِ صحابہ میں

صحابہ کرام فرمودات نبوی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ان کے دور میں قربانی کا رواج اس قدر کم تھا کہ قربانی کے ...ز گوشت بازار میں فروخت ہوتا تھا حضرت ابن عباس سے جب قربانی کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے عکرمہ کو دو درہم ...ر بازار سے گوشت خریدنے کے لئے بھیجا اور تاکید کی کہ راستہ میں ہر ملنے والے سے کہہ دینا کہ بس یہی ابن عباس کی طرف سے ...ربانی ہے۔

قَالَ عِکْرِمَۃُ بَعَثَنِیْ اِبْنُ عَبَّاسٍ بِدِرْھَمَیْنِ اِشْتَرٰی بِھِمَا لَحْمًا وَقَالَ عَنْ لَقِیْتَ فَقُلْ لَہٗ ھٰذِہٖ ...ضْحِیَۃُ اِبْنِ عَبَّاسٍ۔

(بدایۃ المجتہد جلد ۱ صفحہ ۴۱۶)

دوسرے صحابہ کا بھی یہی مسلک تھا اور ان میں سے ایک بھی قربانی کو واجب نہ سمجھتے تھے بلکہ علامہ ابن حزم نے قربانی ...غیر واجب ہونے پر صحابہ کا اجماع نقل کیا ہے۔

قال ابو محمد لا یصح عن احد من الصحابۃ ان الاضحیۃ واجبۃ وصح ان الاضحیۃ لیست ...جبۃ عن سعید بن المسیب والشعبی وانہ قال لان الصدق بثلاثۃ دراھم احب الی من ...ت اضحی۔

...جمہ) ابو محمد فرماتے ہیں کہ قربانی کے غیر واجب ہونے پر صحابہ کا اجماع ہے اور سعید بن المسیب اور الشعبی سے بھی یہی روایت ...ے اور انہوں نے فرمایا کہ قربانی کی بجائے تین درہم خیرات کر دینا ان کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔

(المحلی جلد ۷ صفحہ ۳۵۸)

موذن دربار نبوی حضرت بلال رضی اللہ تعالے عنہ بھی نقد خیرات کو قربانی پر ترجیح دیتے تھے۔

عن سعید بن غفلۃ قال قال لی بلال رضؓ ما کنت ابالی لو ضحیت بدیك ولان اخذ الثمن الاضحیۃ ...ا تصدق بہ علی مسکین مقتر فھو احب الی من ان اضحی

ترجمہ) سعید بن غفلۃ سے حضرت بلال رضؓ نے فرمایا کہ انہیں اس امر کی پروا نہیں ہے کہ وہ قربانی کے لئے مرغ ذبح

کریں بلکہ قربانی کی قیمت لے کر کسی حاجتمند پر خرچ کر دینا ان کے نزدیک قربانی کرنے سے زیادہ افضل ہے

(المحلی جلد ۷ صفحہ ۳۵۸)

بلکہ آپ عملاً قربانی کے لئے مرغ ہی ذبح کرتے تھے۔

وروی عن بلال انہ ضحی بدیکٍ

(ترجمہ) حضرت بلالؓ سے روایت ہے کہ وہ مرغ کی قربانی دیتے تھے

(بدایۃ المجتہد جلد ۱ صفحہ ۴۱٦)

بعض ائمہ نے آپ کے عمل کو نظیر بنا کر پرندوں کی قربانی کو جائز قرار دیا ہے۔

والاضحیۃ جائزۃ بکل حیوانٍ یوکل لحمہٗ من ذی اربع او طائر کالفرس والابل والبقر الوحش والدیک وسائر الطیور والحیوان الحلال اکلہٗ۔

(ترجمہ) ہر حلال جانور کی قربانی جائز ہے چاہے مویشی ہے یا پرندہ۔ مثلاً گھوڑا اونٹ جنگلی گائے، مرغ اور دوسرے تمام پرندے اور حیوان جن کا گوشت حلال ہے۔

(المحلی جلد ۷ صفحہ ۳۷۰)

کبار صحابہ کے متعلق وضاحت سے منقول ہے کہ وہ عمداً صرف اسلئے قربانی نہیں کرتے تھے کہ کہیں لوگ اسے واجب نہ سمجھ لیں۔ امام شافعیؒ جو قربانی کے ضروری ہونے کو تسلیم نہیں کرتے وہ ابوبکرؓ صدیق اور عمرؓ فاروق کے عمل کو اپنے مسلک کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔

وقد بلغنا ان ابابکر وعمر کان لایضحیان کراھۃ ان یقتدی بھما لیظن من راھما... انھا واجبۃٌ۔

(ترجمہ) یعنی حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ فاروق اس خدشہ سے قربانی نہیں کرتے تھے کہ کہیں لوگ ان کی پیروی میں اسے واجب نہ سمجھ لیں۔

(کتاب الام جلد ۲ صفحہ ۱۸۹)

علامہ شوکانی نے بھی حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ فاروق کے قربانی نہ کرنے کی روایت بیہقی کی روایت سے نیل الاوطار جلد ۵ میں نقل کی ہے۔ اہمیت اور مشہوری کی وجہ سے اکثر ائمہ نے اسے نقل کیا ہے۔ علامہ ابن حزم نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

عن ابی سریحۃ حذیفۃ بن اسید الغفاری قال لقد رایتُ ابابکرٍ وعمر مایضحیان کراھۃ ان یقتدی بھما۔

(ترجمہ) حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر قربانی کرنے کو اس خیال کی وجہ سے مکروہ سمجھتے تھے کہ کہیں لوگ اس کا اقتداء ضروری نہ سمجھ لیں۔

(المحلی جلد ۷ صفحہ ۳۵۸)

بلکہ عمر فاروقؓ کے متعلق تو یہاں تک بھی آیا ہے کہ وہ حج کے موقع کی قربانی جس کا ذکر کسی نہ کسی حیثیت سے قرآن مجید میں آیا ہے کو بھی ترک کر دیتے تھے۔

عن ابراھیم وکان عمر یحجُّ ولا یضحی وکان اصحابنا یحجون معھم الورق والذھب فلا یضحون

(ترجمہ) ابراہیم سے روایت ہے کہ حضرت عمر حج کرتے تھے لیکن قربانی ترک کر دیتے تھے۔ اس طرح ہمارے بہت سے رفقاء (حج) کے موقع پر باوجود نقدی ہونے کے قربانی نہیں کرتے تھے۔

(المحلی جلد ۷ صفحہ ۳۵۸)

ائمہ اربعہ میں سے امام مالک رضؓ کا مسلک عمر فاروق رضؓ کے اسی عمل کے مطابق ہے جبکہ وہ حاجی کے لئے بھی قربانی کی رخصت دیتے ہیں

ورخص مالك للحاج في تركها بمنى

(بدایۃ المجتہد جلد ۱ صفحہ ۴۱۵)

ایک اور اجل صحابہ حضرت ابو مسعود انصاری کے متعلق شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں:۔

وقال ابو مسعود الانصاری يغدوا على الف شاة ويراح فلا اضحى مخافة ان يراها الناس واجبة

(المبسوط جلد ۱۲ صفحہ ۸)

(ترجمہ) حضرت ابو مسعود انصاری نے فرمایا کہ میرے پاس صبح شام ایک ہزار بکریاں آتی جاتی ہیں لیکن میں نے اس خوف سے قربانی (ترک) کی کہ کہیں لوگ اسے ضروری نہ سمجھ لیں۔

علامہ ابن حزم نے ان کے مزید یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔

بلاشبہ مسلمانوں کی سہولت اور آسانی کے خیال سے میں قربانی ترک کر دینے کا ارادہ کر چکا ہوں کیونکہ اندیشہ ہے کہ لوگ کہیں (ا)سے ضروری نہ سمجھ لیں۔

(المحلی جلد ۷ صفحہ ۳۵۸)

شمس الائمہ سرخسی نے جہاں حضرت ابو مسعود انصاری کا مسلک نقل کیا ہے وہاں ایک بہت ہی عمدہ اعتراض بھی نقل کیا ہے

لوكان واجبا لم يحل له التناول كما في جزاء الصيد۔

(المبسوط جلد ۱۲ صفحہ ۸)

(ترجمہ) کہ اگر قربانی واجب ہوتی تو جیسا کہ حالت احرام میں شکار کرنے کے تاوان میں فدیہ کے جانور کا گوشت قربانی کرنے والا (خ)ود نہیں کھا سکتا تو اس قربانی کا گوشت بھی کھانا جائز نہ ہوتا۔

ہم نے سلف صالحین کا عمل خود ان کے الفاظ میں نقل کر دیا ہے اور اب اس کا فیصلہ قارئین پر ہی چھوڑتے ہیں کہ کن (کا) مسلک حق ہے لیکن ایک بات کہنے کو جی کرتا ہے کہ موذن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضؓ کا مسلک بہت ہی ترقی پسندانہ تھا۔

نیاز نمبر

جس میں تقریباً ہند و پاک کے سارے ممتاز اہل قلم داکابر ادب نے حصہ لیا ہے اس میں نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو مثلاً ان کی افسانہ نگاری، تنقید، اسلوب نگارش، انشا پردازی، مکتوب نگاری۔ دینی رجحانات، صحافی زندگی، شاعری دادارتی زندگی۔ ان کے افکار دعقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی وادبی مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔

ضخامت ۴۲۴ صفحات قیمت:۔ ۸ روپے (منیجر نگار پاکستان)

عہدِ حاضر کی ایک مہذّب ترین قوم
جو ۵۰۰ سال تک نہیں نہائی

نیاز فتحپوری

یہ سُن کر آپ کو حیرت ہوگی اور ہونا چاہئے کیونکہ غسل گویا ایک فطری تقاضہ ہے جس کے پورا کرنے پر ایک انسان مجبور ہے۔ لیکن جب آپ یہ سُنیں گے کہ میں کس قوم کا ذکر کر رہا ہوں تو آپ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہے گی اور مشکل ہی سے آپ میری بات کا یقین کریں گے۔ کیونکہ آج کل اسی قوم کے اہتمام غسل و صفائی کا یہ عالم ہے کہ اس کے غسل خانے بھی اچھے خاصے عشرتکدہ اور شیش محل نظر آتے ہیں۔

میں جس قوم کا ذکر کر رہا ہوں وہ وہی ہے جسے اب یوروپین کہا جاتا ہے جسے نہایت ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے اور جس کی صاف و پاکیزہ معاشرت پر اس کی تہذیب و شائستگی کی بنیاد قائم ہے۔

آپ شاید یقین نہ کریں گے کہ اسی مہذّب و شائستہ قوم کو کامل پانچ صدی تک نہانا نصیب نہیں ہوا اور وہ اس درجہ غسل سے متنفر رہی کہ اگر کسی نے غلطی سے اس کا اقدام کیا بھی تو اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔

ظہور مسیح سے قبل سلطنت روما میں گرم حماموں کا رواج عام تھا اور رومی سپہ سالار "اگریکولا" نے تو خصوصیت سے بڑے بڑے اچھے حمام تعمیر کرائے تھے لیکن جب عیسوی دور شروع ہوا تو راہبوں نے تمام حمام مسمار کرا دیئے اور حماموں میں نہانے والوں کو کافر و گمراہ قرار دیدیا۔ یہاں تک کہ انگلستان اور فرانس بھی جن کی صفائی کی آج قسم کھائی جاتی ہے، اس سے محفوظ نہ رہے اور رومیوں کی تقلید میں، جو حمام کہیں کہیں تعمیر ہو گئے تھے انھیں بھی مسمار کر دیا گیا۔

آپ نے تاریخ میں فرانس کے مشہور فرمانروا لوئی چہاردہم کا حال پڑھا ہوگا، لیکن یہ بات شاید آپ کے علم میں نہ ہوگی کہ نہانا کیسا، وہ منہ بھی مہینوں تک نہیں دھوتا تھا۔ بالکل یہی حال مارگریٹ کا تھا جو اپنے زمانہ کی جمیل ترین عورت سمجھی جاتی تھی۔

انگلستان کی تاریخ میں ہنری ششم کو بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ اس کا جسم نہ نہانے کی وجہ سے اتنا گندہ و متعفن رہتا تھا کہ اس کے کمرہ میں ناک نہ دی جاتی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب صابون کا استعمال بہت بُرا خیال کیا جاتا تھا اور جسم سے پسینہ کی جو عفونت پیدا ہوتی تھی اسے تیز عطروں کے استعمال سے دور کرنے کی کوشش کی جاتی تھی چنانچہ انگلستان کی مشہور ملکہ ایلزبتھ بھی جو بہت نفیس مزاج تھی اپنے جسم کی بدبو چھپانے کے لئے ہمیشہ عطر ہی استعمال کرتی تھی۔

یہ حالت آٹھویں صدی عیسوی کے وسط تک اسی طرح قائم رہی، یہاں تک کہ روما میں شارلمین تخت نشین ہوا اور اس نے سُنا کہ ایکس لا چپل کے گرم چشمہ میں نہانا صحت کے لئے مفید ہے، چنانچہ یہ وہاں جانے لگا اور پھر اپنے محل میں ایک بڑا وسیع گرم حمام تعمیر کرایا جہاں وہ اپنے دوستوں، عزیزوں اور کبھی کبھی فوج کے سپاہیوں کو بھی نہانے کی دعوت دیتا تھا، لیکن اس عمومیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اچھا خاصا ادارۂ فحاشی بن گیا۔

انگلستان میں گرم چشموں کے پانی سے نہانا دوبارہ بارھویں صدی میں رائج ہوا اور اسی سلسلہ میں غسل کا رواج پھر یورپ میں شروع ہو گیا، لیکن یہاں کے حماموں میں بھی وہی فحاشیاں رائج ہو گئیں جو روما کے حماموں میں پائی جاتی تھیں۔ کیونکہ یہاں مرد اور عورت دونوں ایک ساتھ بالکل عریاں

تھے اور شاید اسی لئے "ایک حمام میں سب ننگے" کی مثل مشہور ہو گئی۔

ہر چند ۱۵۔۔ء میں ایک پادری نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا اور کلیسا کے بڑے بڑے راہبوں نے بھی اس رسم کے بند کرنے کی پوری کوشش کی، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ یہاں تک کہ رات دن یہاں برہنہ عورتوں اور مردوں کا ہجوم نظر آنے لگا اور لوگ ان بے حجابیوں اور فحاشیوں سے لطف اٹھانے لگے۔ جب یہ بات انتہا تک پہنچ گئی تو پھر اس کے خلاف ردعمل شروع ہوا اور رفتہ رفتہ حماموں میں مردوں عورتوں کا ایک ساتھ ننگا نہانا کم ہوا۔ لیکن امراء کے طبقہ میں بدستور یہی رواج جاری رہا، چنانچہ نپولین کی بہن جب دودھ کے بھرے ہوئے ٹب میں ننگی نہاتی تھی تو اس کے مرد احباب بھی موجود ہوتے تھے۔ اس کا معمول تھا کہ جب وہ غسل کی غرض سے کپڑے اتار دیتی تھی تو ایک حبشی غلام گود میں اٹھا کر اسے ٹب میں لٹا دیتا تھا اور جب وہ نہا چکتی تو پھر اسے اسی طرح اٹھا کر باہر لے آتا۔ نپولین کو ایک بار یہ بات ناگوار بھی گزری اور اس نے اپنی بہن سے کہا کہ "یہ طریقہ نامناسب ہے کہ تم جیسی نوجوان و خوبصورت عورت کو ایک مرد عریاں حالت میں ٹب تک لے جائے" لیکن اس نے ہنسکر جواب دیا کہ "کیا حبشی بھی کوئی انسان ہے جس سے پردہ کیا جائے۔"

اسی دورِ عیاشی میں دودھ سے نہانے کی رسم اتنی عام ہو گئی کہ مرد بھی اس کے عادی ہو گئے، یہاں تک کہ کوئنس بری کے چوتھے ڈیوک نے تو شدت و کثرت کے ساتھ دودھ سے نہانا شروع کیا کہ لوگوں کو بازار کے دودھ سے نفرت ہو گئی کہ کہیں ایسا نہ ہو یہ ڈیوک کے جسم کا دھوون ہو۔

ہر چند انیسویں صدی کے اخیر تک امراء میں نہانے کا رواج ہو گیا تھا تاہم آبادی کا بڑا حصہ ایسا تھا جو نہ باقاعدہ نہانے کا عادی تھا اور نہ اس کے گھروں میں غسل خانے پائے جاتے تھے۔ لیکن جب پہلی جنگ عظیم کے بعد لوگوں میں ذہنی انقلاب پیدا ہوا تو پابندی کے ساتھ روز صبح کے وقت نہانا بھی یوروپ کی معاشرت میں شامل ہو گیا اور یہ صرف نصف صدی پہلے کی بات ہے۔

(جنگ)

اقبال نمبر

جس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتداء اور مختلف ادوار

شاعری اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم، اخلاق و تصوف اس کا آہنگ تغزل اور

اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت ــــــــ تین روپے

منیجر۔ "نگار پاکستان" گارڈن مارکیٹ، کراچی

بابُ الانتقاد

محمد انصار اللہ نظر

اُردو کے قدیم ترین تذکروں میں تحفۃ الشعرا کا شمار ہوتا ہے، اس کو ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب نے مرتب کر کے ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے ۱۹۶۱ء میں شایع کر دیا ہے۔ شروع میں چار صفحوں کا ایک مقدمہ ہے جو مطبوعہ نسخہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے نہایت اہم ہے۔ جن قلمی نسخوں سے مطبوعہ نسخہ کا متن تیار کیا گیا ان کے متعلق صرف حسب ذیل جملے ملتے ہیں۔

"اس تذکرے کے جو نسخے ہمیں ملے ان میں سے کسی میں بھی اس کے حالات نہیں پائے گئے، یہ سب نسخے میرزا مظہر جان جاناں کے حالات پر ختم ہو جاتے ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نسخے ناقص الآخر ہیں یا یہ کہ اس (مصنف) کو اپنے حالات لکھنے کا موقع نہیں ملا"

اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ مرتب کو ان خطی نسخوں کے مکمل ہونے پر شک ہے، مصنف کے الفاظ یہ ہیں:۔

"چنانچہ تفصیل ان در ضمن احوال خود کہ در خاتمہ مرقوم ساختہ مفصل ظاہر خواہد گردید" (۱۲۲)

"مرقوم ساختہ" سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف اپنے حالات لکھ چکا تھا، موقع نہ ملنے کا سوال نہیں، ایسی صورت میں مرتب کے اسی قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ وہ خطی نسخے جن کی مدد سے متن تیار کیا گیا تھا ناقص الآخر تھے۔

"اس تذکرے کے کل تین نسخے دو کتب خانہ آصفیہ میں اور ایک کتب خانہ نواب سالار جنگ میں ہیں، انہی تین نسخوں کے باہمی مقابلے کے بعد یہ ایڈیشن مرتب کیا گیا ہے جہاں ان نسخوں میں نمایاں اختلاف پایا گیا وہ حاشئے پر درج کیا گیا ہے" (۵)

گویا ان تین خطی نسخوں میں نمایاں اختلافات بھی موجود ہیں، یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ نسخے کب لکھے گئے؟ کاتب کون تھا؟ کتابت کا مقصد کیا تھا؟ کاغذ، خط تحریر، روشنائی، جدول وغیرہ کا ذکر بھی نہیں، یہ بھی نہیں بتایا کہ تینوں نسخوں میں شعراء کے ذکر کی ترتیب میں کوئی اختلاف تھا یا سب یکساں ہی تھے ناقص الآخر یا مکمل ہونے کی بحث آخری صفحہ کی تفصیلات اور جزئیات پر غور کر کے بہت کچھ طے کی جا سکتی ہے، خطی نسخوں کے صفحات پر اعداد شمار درج تھے یا نہیں؟ یہ بات بھی اس سلسلہ میں مفید ہو سکتی تھی لیکن ان سب کا ذکر نہ کر کے ہر قسم کے امکانات کے لئے گنجایش چھوڑ دی، مثلاً یہ کہ مصنف نے تذکرہ پہلی بار ۱۱۶۵ھ میں لکھا جس کے قطعہ تاریخ کہے گئے لیکن وہ اس پر بہت بعد تک نظر ثانی کرتا رہا (جیسا کہ اکثر تذکروں میں ہوا ہے) اگر ایسا ہے تو تذکرے کی قدامت کے لحاظ سے وہ اہمیت نہیں کہ جو بیان کی گئی، مصنف کا بیان ہے کہ وہ اپنے عہد کے شعراء کا حال لکھتا ہے اور

"شروع از احوال درویشاں عالی شان صفا کیشاں نمود" (۴)

گردیزی نے اپنے تذکرہ کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے رکھی، میر حسن وغیرہ نے شعراء کو طبقات میں تقسیم کیا، اور تحفۃ الشعراء کے مصنف نے ان کو ان کے مسلک کے لحاظ سے مرتب کیا، ترتیب کے سلسلہ میں یہ جدت یقیناً قابل قدر تھی، لیکن مطبوعہ نسخہ میں یہ ترتیب قائم نہیں ہے — ترتیب کے متعلق کوئی اشارہ نہ ہونے کے سبب اس قیاس کے لئے بھی گنجایش رہتی ہے کہ قلمی نسخوں کے اوراق کی ترتیب امتداد زمانہ سے بدل گئی ہو۔

مخطوطات میں جو نمایاں اختلافات ملتے ہیں ان کے اسباب بھی مختلف ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصنف نے نظر ثانی کے وقت بعد اضافہ و ترمیم کی ہو، اس کے بھی امکانات ہیں کہ کاتب نے الحاق کیا ہو، دونوں صورت میں اضافہ کردہ حصص کا زمانہ تصنیف (۱۱۶۵ھ) کے بعد کا ہونا یقینی ہے، پھر الحاقی عبارت کے لئے مصنف کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اب ان اختلافات کی نوعیت بھی دیکھیں۔

شاہ سراج الدین کے حالات چار سطر میں لکھنے کے بعد متن میں یہ عبارت ملتی ہے:-

"در نسخہ دیگر این حالات اضافہ است" (۲۲)

اس کے بعد دو سطر لکھی ہیں اور اسی کے تسلسل میں نو سطور اور بھی لکھی ہیں جن کے بائیں طرف قوس بنا کر حاشیہ پر یہ لکھا ہے:

"در نسخہ دیگر نمبری ۱۲۲ این عبارت مرقوم است" (۲۳)

"نسخہ دیگر" اور "نسخہ دیگر نمبری ۱۲۲" کیا ہے؟ اس کا علم صرف مرتب کو ہو سکتا ہے، البتہ اضافہ اور الحاق ان نسخوں میں جو کچھ بھی ہوا تھا اور جس نے بھی کیا تھا اب وہ سب مطبوعہ نسخہ کے متن میں ملحق ہے، تدوین (editing) کے کچھ اصول ہیں، ایک یہ بھی کہ اصولاً کسی ایسے نسخہ کو جو اوروں کی نسبت زیادہ معتبر اور قابل وثوق ہو بنیاد بناتے ہیں اور اس کے بعد دوسرے نسخوں سے مقابلہ کر کے متن کی اصلاح کرتے ہیں، یہ اصول اس قدر عام ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی، لیکن "نسخہ دیگر" وغیرہ کی مہمل علامات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحفۃ الشعرا کے مرتب نے کسی خاص نسخہ کو بنیاد نہیں بنایا تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ یہ فیصلہ بھی نہ کر سکے کہ ان میں سے کون زیادہ معتبر، مستند، قدیم یا صحیح ہو سکتا ہے، چنانچہ تینوں نسخوں کی غلطیاں اور خامیاں مطبوعہ نسخہ میں شامل ہو گئیں۔ مثال کے طور پر خواجہ ایوب کے نام سے ایک غزل یہ لکھی ہے (۷ شعر)

دل می طپد از ذوق ندانم خبری کیست ۔۔۔ رنگم بپرد از چہرہ دریں رہگذری کیست (ص۱۰۵)

دوسرے نسخہ میں یہی غزل درگاہ قلی خاں کے نام سے لکھی تھی، مرتب تحفۃ الشعرا نے اسے درگاہ قلی خاں کے نام سے بھی (متن ہی میں) لکھ دیا اور حاشیہ پر لکھا:

"یہ اشعار پہلے نسخہ میں خواجہ ایوب کے تذکرے میں دیئے گئے ہیں" (ص۱۰۱)

یہ امر یقینی ہے کہ اس غزل کا کہنے والا ایک ہی شاعر ہو سکتا ہے۔ دوسرے شاعر سے بھی منسوب کر دینے کی غلطی مصنف نہیں کر سکتا صرف کاتب یا کوئی نامہ ہو سکتا ہے اس کے باوجود اسے متن میں شامل کر لینا صرف مرتب تحفۃ الشعرا کا کام تھا۔

شاہ فضل اللہ نقشبندی کے کلام میں یہ دو شعر ملتے ہیں۔

جب تلک تھی جنس گھر میں بیچ کھاتا تھا فقیر ۔۔۔ اب تو کچھ باقی رہا نہیں ہے مگر بیچوں خدا

طبیب عشق سیں پوچھا زلیخا نے علاج اپنا ۔۔۔ کیا تجھ پر بھلا ہے سورۂ یوسف کا دم کرنا (۱۵)

یہ دونوں اشعار میر یحییٰ کے کلام میں بھی شامل ہیں اور لطف یہ ہے کہ (ص۱۵۲) متن میں داخل کرتے وقت کبھی مرتب کو یہ خیال نہ آیا کہ کم از کم اس الحاق کے لئے ویسا ہی حاشیہ لکھ دیتے جیسا خواجہ ایوب کے سلسلہ میں لکھا ہے ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تینوں نسخوں کے فرق کو بجنسہٖ مطبوعہ تذکرہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ان میں امتیاز کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی گئی۔ تصحیح یا تحقیق کا تو سوال ہی نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو اغلاط بہت ملیں گی مثلاً ایما کے نام سے ایک مطلع یہ لکھا ہے

یار گھر جاتا ہے یارو کیا کروں ۔۔۔ آہ گھر جاتا ہے یارو کیا کروں ص۱۵۲

یہی مطلع تذکرہ گردیزی میں صانع کے نام سے ملتا ہے (ص۱۰۱) وغیرہ۔

مرتب تذکرہ نے صاف الفاظ میں یہ بات کہی ہے کہ "نمایاں اختلاف" ظاہر کئے گئے ہیں، اور ایسے اختلافات بھی تھے جن کو انھوں نے "غیر نمایاں" جانا۔ اس کی مثال اوپر درج کی گئی۔ یہ "غیر نمایاں" اختلافات کچھ اشعار ہی تک محدود نہیں بلکہ نثر کی عبارت میں بھی ملیں گے۔ سید محمد صاحب نے گلشن گفتار مولفہ حمید اورنگ آبادی کو مرتب کر کے شائع کیا۔ انھوں نے بعض دوسرے تذکروں سے بھی ان شعرا کے حالات حاشیہ پر لکھ دیئے ہیں جن کا ذکر گلشن گفتار میں ملتا ہے۔ ان تذکروں میں ان کے پیش نظر "تحفۃ الشعرا از ابراہیم بیگ[1] قاقشال قلمی" (۶۹) بھی تھا۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نسخہ ان تین قلمی نسخوں میں کا ایک ہے جو مرتب تحفۃ الشعرا ڈاکٹر حفیظ قتیل کے پیش نظر تھے، لیکن اگر ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ اس کے تین ہی نسخے مل سکے تو یہ قیاس بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ سید محمد صاحب کا خطی نسخہ ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب کے نسخوں میں شامل تھا۔ بہر حال گلشن گفتار میں نقل شدہ تحفۃ الشعرا کی عبارت سے مطبوعہ تحفۃ الشعرا کی بعض عبارتوں کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

عبارت تحفۃ الشعرا مطبوعہ	عبارت تحفۃ الشعرا قلمی بحوالہ گلشن گفتار
۱۔ فضلی	
مدتی در لشکر۔ بموجب حکم رسول مقبول ماند (۱۳)	بموجب حکم رسول مقبولؐ بود (۵۶)
عضد الدولہ (۱۴)	نواب عضد الدولہ (〃)
رسالہ زاد ازآد (۱۴)	رسالہ زاد راہ (〃)
بہ زبان ہندی گفتہ وابیات ایہام خوب دارد (〃)	بہ زبان ہندی گفتہ وایہام خوب دارد (〃)
و در فارسی نیز اشعار او صاف و شیریں است (〃)	و در فارسی و ہندی نیز اشعار او صاف و شیریں است (〃)
۲۔ عاجز عارف الدین	
عارف الدین عرف میرزائی عاجز تخلص (۱۱۲)	عارف الدین خاں عرف مرزائے عاجز تخلص (۶۱)
نصیبہ واخر بخشید (〃)	بہرۂ وافر بخشید (۶۱)
بخدمت بخشی گیری (〃)	بخدمت بخشی گری (۶۲)
بافقیر محرر (〃)	بافقیر حقیر (〃)
۳۔ آقا امین دفا	
بہ مرتبہ امارت رسیدہ (۱۱۹)	بہ امارت رسیدہ (۶۴)
در بلدۂ ایلچپور برار منزوی گردید از یافت (۱۱۹)	در بلدۂ ایلچ پور صوبہ برار ..... یافت — (۶۴)
۴۔ عزلت عبدالولی	
ملامتیہ مشرب دارد (۱۶)	بلا قید مشرب دارد (۶۸)

ان دو مطبوعہ نسخوں میں یہ اختلاف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ قلمی نسخوں میں ایسے اختلافات بھی موجود تھے جو متن مفہوم پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور اس نوع کے اختلافات کا مطبوعہ نسخہ میں اظہار نہیں کیا گیا ہے۔

---

[1] ابراہیم بیگ کتابت کی غلطی سے لکھا گیا ہے صحیح نام افضل بیگ قاقشال ہے (گلشن گفتار ص۱۳)

مطبوعہ تحفۃ الشعرا کا مطالعہ صحت متن کے لحاظ سے بھی دلچسپ ہے۔ فارسی میں یائے معروف اور یائے مجہول کے فرق کو وہ اہمیت حاصل نہ تھی جو اردو میں ہے، لیکن قدیم اردو مخطوطات میں بھی فارسی کے زیر اثر یائے معروف اور یائے مجہول میں فرق نہیں ملتا، اسی طرح کاف اور گاف میں بھی ایک اور دو مرکزوں کا لازماً لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ منقولہ حروف پر ہمیشہ نقطے بھی لگانے کا التزام نہیں کرتے نتیجہ یہ کہ اکثر پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ قدیم املا سے بھی آج کسی قدر فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ دقتیں عام ہیں چنانچہ جو صاحبان قلم مخطوطات پر کام کرتے ہیں وہ اکثر ان دقتوں پر حاوی ہوجاتے ہیں چنانچہ بعض مستثنیات سے قطع نظر عام طور پر صحیح متن تیار کر لئے جاتے ہیں۔ لیکن تحفۃ الشعرا کے مطبوعہ نسخہ میں عجیب گل کھلے ہیں جن پر حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی اس کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں :-

صفحہ	متن مطبوعہ	متوقع صحیح متن
۱۱۷	میرے رنگیں ادا سیں باغباں گلگوں ہے کیا نسبت کہ ہم سنتے ہیں تیرے باغ کے پھولوں میں ہے پھکری	مرے رنگیں ادا سیں باغباں گل کوں ہے کیا نسبت ———— پھکری
۱۷۰	دھری سیپارہ کل آج آگے عندلیبوں کے چمن کے بیچ گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے	دھرے سیپارۂ گل آج آگے عندلیبوں کے چمن ———— کے
۲۵	بہار ساقی ہی بزم گلشن ہیں مطربان چمن شرابی پیالہ گل سر سبز شیشہ شراب بو اور گل گلابی	بہار ساقی ہے، بزم گلشن، ہیں مطربانِ چمن شرابی پیالہ (تو) گل ہے، سبزہ شیشہ، شراب بو اور گل گلابی

مرتب تحفۃ الشعرا حفیظ قتیل صاحب کا نام بتاتا ہے کہ موصوف شاعر بھی ہیں، اگر شاعر نہ ہوتے تو بھی اردو کے سند یافتہ فاضل کی حیثیت سے اس کی توقع تو بہر حال کی جاتی ہے کہ موزونیت شعر سے واقف ہوں گے۔ شعر کو موزوں پڑھ لینا مذاق سلیم پر بھی منحصر ہے اور اس کے لئے بہت زیادہ علمیت لازماً درکار نہیں حیرت یہ ہے کہ تحفۃ الشعرا میں غیر موزوں اشعار کافی تعداد میں لکھے ہیں، چند اشعار ملاحظہ فرمایئے :-

کبوتر جا کے کہہ یوسف کوں کر سے نکل ——— تجھ بنا روز زلیخا ہو رہی ہے باؤلی (۱۶)

مصرعۂ اول اس طرح موزوں ہوتا ہے ——— (اے) کبوتر جا کے کہہ یوسف کوں (کنوے) سے نکل

ضعف ہمت سستی دل ہوس طرف چھپا تھا ——— شوق خود تازہ جواں تھا مجھے معلوم نہ تھا (۲۲)

پہلا مصرعہ ناموزوں ہے۔

بہار در دکوں اس غنچہ دل ہیں توں مخفی لکھ ——— نہ کر ہر گل خزاں چہرہ سوں راز نہاں میرا (۲۷)

دوسرا مصرعہ غالباً اس طرح صحیح تھا ——— نہ کہہ ہر گل خزاں چہرہ سوں توں راز نہاں میرا

رباعی کے آخری دو مصرعے یہ ہیں :-

کیا بیش بہا ہیں آنسوؤں کے موتی ——— کہتا ہے وہ ہنس کے رولو رولو (۱۱۱)

دوسرا مصرعہ غیر موزوں ہے۔

ہم اس کوں جانتے تھے دوست اپنا مہرباں اپنا ہمارے ہاتھ سے بھاگا ہے دل بیجان اپنا (۱۶۹)

پہلا مصرعہ اس طرح موزوں ہو جاتا ہے :- ہمارے ہاتھ سے بھاگا ہے دل یہ لے کے جاں اپنا

قفس کے بیچ کیا حسرت سنی بلبل یہ کہتی تھی کہ پھر بھی دیکھنا قسمت میں ہووے گا بوستاں اپنا (۱۶۹)

دوسرے مصرعہ میں "ہووے گا" کی جگہ "ہو گا" پڑھیئے۔

ان سے بھی زیادہ دلچسپ اور افسوسناک وہ مقامات ہیں جب دو مختلف اشعار کے ایک ایک مصرعہ کو ملا کر شعر بنا لیتے ہیں اسکی مثال بھی دیکھ لیجئے :-

بھوت عاشق ہیں مار کھاتے ہیں
مجھکو ترے فراق میں دن کاٹنے لگے (۱۵)

دونوں مصرعے الگ الگ بحروں میں ہیں، معنوی اعتبار سے بھی کوئی ربط نہیں، پھر دوسرے مصرع میں "کاٹنے" کی جگہ "کاٹنے" صحیح ہے۔

مطبوعہ تحفۃ الشعرا کے متن کا مطالعہ کر لینے کے بعد اس کے مقدمہ وغیرہ پر بھی ایک نگاہ کر لینی مناسب ہوگی۔ چار صفحہ کے مختصر سے مقدمہ میں تین صفحہ سے قریب پر تحفۃ الشعرا کے اقتباسات درج ہیں۔ مصنف کے حالات کے متعلق لکھا ہے کہ "کسی تذکرے میں دستیاب نہیں ہوئے"، اس کی شاعری یا تصنیف وغیرہ سے بھی بحث نہیں کی گئی ہے۔ تذکرے کے انداز تحریر پر غور کریں تو چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

مصنف مرزا افضل بیگ قاقشال کے احباب میں سے اکثر شاعر تھے، اپنے تذکرے میں اس نے بیشتر ان ہی شعرا کا ذکر کیا ہے جن سے براہ راست یا بالواسطہ اس کے تعلقات تھے۔ اتنے شعرا سے روابط، شعر و شاعری سے اس کی اس حد تک دلچسپی کہ وہ تذکرہ لکھنے بیٹھ گیا قابل لحاظ ہے۔

دیباچہ میں اس نے آٹھ تذکروں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ متن میں مختلف کتابوں کے اقتباسات درج کئے ہیں، اور اکثر شعرا کا کلام درج کیا ہے، یہ سب چیزیں اس کی علمیت اور شعر و سخن سے دلچسپی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

اکثر شعرا اس کے پاس آتے تھے اور اسے اپنا کلام سناتے تھے، اتنا ہی نہیں قاقشال کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ گوئیے بھی اس کے حضور میں اپنے کمالات پیش کرتے تھے اس نے خود لکھا ہے کہ :-

"ایں کبت کے در نعت حضرت سید المرسلین است حاجی سلیمانی کلاونت کہ از لازمان سرکار بود بہ حضور احقر محرر راگنی دھناسری درباری خواندہ" (۸۵)

قاقشال کی نثر بیشتر مقفی اور اکثر مسجع ہے، یہ بھی اسکے شاعرانہ مزاج کے سبب معلوم ہوتا ہے۔ اس کو آزاد بلگرامی نے اپنے قطعہ تاریخ میں "قدر دان صاحبان معنی" کہا ہے (۳) دیباچہ میں قاقشال نے پانچ رباعیات بھی لکھی ہیں۔ یہ رباعیات اس طرح تحریر کی گئی ہیں کہ عبارت کا جز ولاینفک ہو گئی ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ بھی قاقشال ہی کی تصنیف ہوں گی۔ عاجز نے قطعۂ تاریخ میں تحفۃ الشعرا کو "نسخہ تازہ" کہا ہے، اس سے قاقشال کی کسی دوسری تصنیف کی طرف تو اشارہ نہیں جو اس سے پہلے وجود میں آ سکی ہو ؟

قاقشال کا عقیدہ اس سے ظاہر ہے کہ وہ لکھتا ہے۔

" ہزاران ہزار نعت و ثنا بر چہار یار کبار او کہ چہار آئینہ اسلام اند و ہر یکی سرغیل انام " (۲)

لیکن وہ نہایت غیر متعصب شخص ہیں چنانچہ عزلت کے وہ اشعار بھی اس نے نقل کئے ہیں جو قاقشال کے عقید پر تبرا کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تحفۃ الشعرا کی بعض خصوصیات قابل لحاظ ہیں۔ قدیم تذکروں میں عام طور پر صرف غزلوں سے اشعار کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ قاقشال نے قصیدہ، رباعی، ہزل کے اشعار بھی انتخاب کرکے درج تذکرہ کئے ہیں اور ایسے اشعار بھی لکھے ہیں جو " تعریف رقص " وغیرہ میں لکھے گئے تھے۔ قاقشال نے زمانہ وسال کے اندراج کا بھی جہاں تک ممکن ہوا التزام کیا ہے۔ قدیم تذکروں میں کبھی شاعر کے تخلص، نام یا ایک شعر پر بھی اکتفا کرتے تھے، قاقشال نے تھوڑے بہت حالات ہر شاعر کے لکھے ہیں۔

مطبوعہ تحفۃ الشعرا کے مقدمہ میں ہے کہ اس میں کل باسٹھ شاعروں کا ذکر ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس میں صرف اکسٹھ شاعروں کے حالات مندرج ہیں، مرزا عبدالقادر بیدل کی رباعی محض ضمناً لکھی گئی ہے۔ ان کا ذکر مقصود نہیں تھا وحدت کے حالات میں بیدل کا نام آیا ہے (۱۱) لیکن ان کی رباعی عزلت کے کلام کے وسط میں درج ہے (۱۷) رباعی کے اس موقع اندراج کی وجہ ظاہر نہیں۔ شعرا کی تعداد کے فرق کا سبب یہ ہے کہ مرتب نے کوئی فہرست یا اشاریہ بنانے کی زحمت نہیں اٹھائی۔

بعض جگہوں پر حاشیہ میں چند تذکروں کے حوالے بھی لکھے ہیں لیکن یہ بھی نہایت سرسری ہیں۔ ہر شاعر کے سلسلے میں ان کا بھی التزام نہیں، ان میں سے بعض غلط بھی ہیں مثلاً عزلت کے لئے گلزار ابراہیم ص ۱۷۴ کا حوالہ ہے ص ۱۷۳ چاہئے اسی طرح مفضل کے لئے گل عجائب ص ۲۲ کا حوالہ دیا ہے یہ ص ۱۲۲ ہونا چاہئے وغیرہ۔

متن میں شاعر کے نام کے بعد توسین میں سال ولادت و وفات بھی بعض جگہ لکھا ہے یہ مرتب کا " الحاق " ہے اور اس کا بھی ہر موقع پر التزام نہیں کیا گیا، پھر ان سنین کی صحت کے لئے کوئی سند پیش نہیں کی گئی۔ چنانچہ ان پر اعتماد بھی نہیں کیا جا سکتا ترتیب کی ان تمام خامیوں کے باوجود تحفۃ الشعرا اپنی قدامت اور دوسری خصوصیات کے پیش نظر اردو کا اہم تذکرہ ہے۔

ہندی شاعری نمبر

جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔ اس میں تمام ہندی شعراء کے کلام کا انتخاب ترجمے کے ساتھ درج ہے۔ ساتھ ہی ہندی کے تمام اصناف شعری ان کے موضوعات اور مباحث اور ساتھ ہی اردو شاعری سے تقابل و تبصرہ پر سیر حاصل مقالات ہیں ہندی کی اصل قدر و قیمت معلوم کرنی ہو تو اردو میں صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔

شائقین ادب کے لئے یہ خاص نمبر از بس ضروری ہے قیمت۔ ۴ روپے

نگار پاکستان۔ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

باب المراسلہ

ایک مولویانہ احتجاج

(عبد المجید حیرت بی۔ اے۔ کلفٹن۔ کراچی)

مخدومی و محترمی۔ اسلام علیکم!

مارچ کا "نگار" کل مل گیا۔ شکریہ اور بہت شکریہ۔ کاش ایسا ہوتا کہ "نگار" صرف ادبی شعری، تاریخی اور تحقیقی موضوعات تک محدود ہوتا اور "مذہب" پر گفتگو کے لئے کوئی اور رسالہ ——— "نگار" ہی میں دین و مذہب پر تیر و نشتر چلتے دیکھکر آپ کے حیرتِ ایسے نیاز مندوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس باب میں .... بہت بے لگام ہے اور بدنام ——— پھر بزعم خود جو "نیک کام" وہ کر رہا ہے آپ کیوں کریں یا اگر وہ کوئی "کارِ ثواب" ہے تو مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں"

(نگار) آپ کے مخلصانہ مشورہ کا شکریہ۔ کاش آپ یہ بھی فرما دیتے کہ مارچ کے کن مضامین کو آپ "مذہب پر تیر و نشتر" قرار دیتے ہیں، غالباً آپ کی مراد ان مضامین سے ہوگی جو باب الاستفسار میں برزخ اور پل صراط کے عنوان سے شائع ہو گئے ہیں۔ اگر میرا قیاس صحیح ہے تو میں حیران ہوں کہ ان میں کس بات نے مذہب اور آپ کے دل پر تیر و نشتر کا کام کیا۔ میں نے ان مضامین میں ازروئے عقائد مذاہب عالم یہ ظاہر کیا ہے کہ برزخ اور صراط کا جو مفہوم عام مسلمانوں میں رائج ہے وہ یقیناً تعلیمات قرآنی کے منافی ہے اور میں نے اس کے ثبوت میں خود کلام مجید سے استناد کیا ہے۔ اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ مضامین دیکھ کر آپ کو اس لئے تکلیف نہیں ہوئی کہ وہ تعلیمات قرآنی کے مخالف ہیں۔ بلکہ محض اس لئے کہ وہ آپ کے اُن ذاتی اعتقادات کے منافی ہیں جو تیسرے درجے کی مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے آپ کے ذہن نشین ہو گئے ہیں۔

اگر آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو میں شاید اس کی تحریر پر اعتنا نہ کرتا۔ لیکن چونکہ آپ ماشاءاللہ اچھے تعلیم یافتہ وسیع المطالعہ انسان ہیں اور مجھے آپ سے خلوص بھی ہے اس لئے باور کیجئے کہ جتنی تکلیف آپ کو میرے مضامین سے پہنچی ہے اس سے کہیں زیادہ اذیت مجھے آپ کی تحریر پڑھ کر ہوئی۔

اس کا علم تو مجھے ایک حد تک ضرور تھا کہ آپ صوفی منش انسان ہیں، لیکن اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ کبھی آپ.

میلاد خواں مولویوں کے ہفوات کے بھی قایل ہو سکتے ہیں جن کے مذہب کی بنیاد قرآن پاک پر نہیں بلکہ صرف موضوع احادیث اور لایعنیات پر قائم ہے۔ حیرت ہے کہ ایک طرف آپ اسلام کو دنیا کا فطری و آخری مذہب بھی قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف دوسرے مذاہب کے ان خرافات کو بھی اس میں شامل کرنا چاہتے ہیں جو یکسر خلاف عقل و فطرت ہیں۔ آجتک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ سب سے زیادہ سمجھ میں نہ آنے والی باتیں کیوں مذہب کا جزو قرار پائیں۔ جبکہ ان کا تعلق نہ تعلیم اخلاق سے ہے نہ تہذیب نفس سے۔

مثلاً اگر میں کہتا ہوں کہ برزخ و صراط کا مفہوم اسلام میں وہ نہیں ہے جو دیگر مذاہب باطلہ میں پایا جاتا ہے تو آپکو یہ بات کیوں ناگوار ہوتی ہے۔ کیا اسلام کی صداقت تسلیم کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے دوسرے مذاہب کے اکاذیب پر ایمان لے آیا جائے۔ اور ادنیٰ درجے کے احمقانہ لٹریچر کو کلام پاک سے زیادہ مستند سمجھا جائے۔

اگر اسلام کوئی معمہ یا چیستان نہیں ہے تو اسے ہر شخص کی سمجھ میں آنا چاہئے، اور ہر شخص میں آپ اور ہم سب شامل ہیں لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ آپ اپنے ساتھ مجھے بھی اس سے خارج کئے دیتے ہیں۔ پھر یوں آپ کی خاطر سے چاہے میں اپنے آپ کو فاطر العقل اور سفیہ و احمق باور کر لوں لیکن مجھے خود ایسا سمجھنے پر مجبور نہ کیجئے۔

آپ نے اپنی تحریر میں اپنے جس دوست کا ذکر کیا ہے اور جن کی بدلگامی و بدنامی پر اظہار تاسف فرمایا ہے۔ وہ وہی بزرگ ہیں جو کسی وقت آپ کے دوست تھے۔ اور میرے شدید مخالف لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ وہ میرے ہمنوا ہیں اور آپ ان سے بیزار؟ پھر میں آپ کو اس پر تو مجبور نہیں کر سکتا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسی کو صحیح باور کیجئے لیکن اتنی التجا ضرور ہے کہ کبھی کبھی دوسروں کو بھی خطاوار سمجھ لیا کیجئے۔ میں بیوقوف سہی۔ لیکن کیا کسی اور کا مجھ سے زیادہ احمق ہونا آپ کے نزدیک محال عقلی ہے۔

اور ہاں۔ یہ تو میں آپ سے پوچھنا بھول ہی گیا کہ وہ "مقامات آہ و فغاں" جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ کہاں اور کیسے ہیں؟ اگر وہ سرحد عقل و ادراک سے باہر نہیں ہیں تو میں ضرور ان پر بھی غور کروں گا۔

نگار پاکستان کا **نظیر نمبر** ایک خاص شمارہ

جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک، اس کا فارسی و اُردو کلام میں عارفانہ، اس کی قدرت بیان و زبان، اس کا معیاری تغزل، ادبیات اردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ، اس کے امتیازات اور محاسن شعری۔ اس کا شاعری میں مقام، صناع و طباع شعراء کا فرق۔ معاصرین کی رائیں، مستند ادبا کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اس کی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔

اس خاص نمبر کی ترتیب میں بڑی دماغ سوزی جگر کادی اور قابل قدر تحقیق و تدقیق سے کام لیا گیا ہے اور نظیر اکبر آبادی کے موافقین و مخالفین کی رایوں پر فاضلانہ اور بے لاگ تبصرے کئے گئے ہیں۔ اسی طرح یہ خاص نمبر اپنی جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے ریسرچ کے طلبا اور شائقین ادب کے لئے بیحد مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

قیمت :- تین روپے

باب الاستفسار

(بطِ مے)

(جناب زین الدین - اجمیر)

"بطِ مے" سے کیا مراد ہے۔ شراب کو بطّ سے کیا تعلق ؟

(نگار) بطّ عربی لفظ ہے۔ بہ معنی مرغابی۔ لیکن وہ صراحی یا ظرف جو بطّ کی شکل کا بنایا جاتا تھا اسکے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگا، اور جب اس میں شراب بھری جانے لگی تو اسے بطِ مے، بطِ بادہ اور بطِ صہبا کہنے لگے۔ صائب کا شعر ہے:-

نشۂ بادۂ توحید براں رند حلال   کہ بطِ بادہ کم از مرغِ حرم نشناسد

سراج المحققین کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بط پتھر کی ہوتی تھی:-

ندرو ساغرم در عالم آب   رواں ہمچو سنگین بط در آب ست

لیکن یہ صراحی اگر شیشہ کی ہوتی تھی تو اسے آبگینہ کہتے تھے۔ خیر یہاں تو ذکر صرف اس کی صورت کا تھا اور کبھی ظرف کا بطّ یا مرغابی کے ہم شکل بنانا کوئی ایسی نئی بات نہیں۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ عربوں نے اپنے دورِ حضارت میں ہنگام مے نوشی اس سے واقعی بطّ کا کام لیا اور عجیب وغریب تفنن اس میں پیدا کیا۔

ایک نہایت شاداب وپُر گُل باغ کے وسط میں ایک خوبصورت دائرہ دار نہر جاری ہے۔ اس کے کنارے رندانِ مے آشام بیٹھے ہیں۔ ایک پُر شباب حسین وجمیل کنیز ساقی گری کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ جام میں شراب بھرتی ہے اور جس کو دینا مقصود ہوتا ہے اس کو "کاسک یا ابن فلاں" کہکر خطاب کرتی ہے اور پانی کی لہروں پر جام کو چھوڑ دیتی ہے۔ جب وہ پینے والے کے قریب پہونچتا ہے تو اسے اُٹھا کر پی لیتا ہے اور پانی پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ گھوم پھر کر وہ بار دگر ساقی گل اندام کے نازک ہاتھوں تک پہونچ جائے۔

معلوم نہیں مے نوشی کا یہ طریقہ ایران میں رائج تھا یا نہیں لیکن عربوں میں تو یقیناً تھا، چنانچہ ابو محمد عبدالجبار بن حمدیس الصقلی ایک ایسی ہی مجلس کا حال ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:-

وساقیۃ تسقی الندامی بمدھا   کئوسا من الصہباء طاغیۃ السکر

یعوم فیہا کل جام کانما   تضمن روح الشمس فی جسد البدر

اذا قصدت منالدیما زجاجۃ   تنادلہا رفقا بانملۃ العشر

فیشرب منہا سکرۃ عنبیۃ   تنوم عین الصحو منہ وما یدری

ویرسلھا فی ما ئہا فیعیدھا — الی راحتے ساقی علی حکمہ تجری

یعنی:- ایک نہر جو اپنی لہروں کے ہاتھ سے منجواروں کو تیز و تند شراب پلاتی ہے۔ اس میں تیرتا ہوا ہر لبریز جام ایسا نظر آتا ہے جیسے چاند کے جسم میں آفتاب کی روح جھلک رہی ہو۔ جب ہم میں سے کسی کی طرف یہ جام آتا ہے تو نرمی سے اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیتا ہے اور اس کا جرعۂ انگوری پی جاتا ہے جس سے بیداری و ہشیاری کی آنکھ محو خواب ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ جام کو پانی پر چھوڑ دیتا ہے اور وہ پھر ساقی کے پاس پہونچ جاتا ہے۔

(۲)

لکم دینکم ولی دین

(محمد خورشید علی - مظفر نگر)

سورۂ قل یا پڑھتے اور اسکے معنی دیکھنے کے بعد جو عام ترجموں میں پائے جاتے ہیں، بعض شکوک میرے دل میں پیدا ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ ایک بار "لا اعبد ما تعبدون ولا انتم عابدون ما اعبد" کہنے کے بعد دوبارہ کیوں "ولا انتم عابدون ما اعبد ولا انا عابد ما عبدتم" کہا گیا جبکہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔

دوسری بات یہ کہ "لکم دینکم ولی دین" کہنے سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کفار کی طرف سے نہ صرف یہ کہ مایوس بلکہ خائف بھی ہوگئے تھے اور رفع شر کے لئے آپ کو یہ کہنا پڑا کہ "تمہارا دین و مذہب تمہارے ساتھ ہے اور میرا دین و مذہب میرے ساتھ"۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ "ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے اور تمہارا خدا تمہارے ساتھ" اور مقصود جھگڑے کو ختم کرنا یا پیچھا چھڑانا ہو۔ اگر معنی یہی ہیں تو اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس طرح رسول اللہؐ نے اپنی دعوتِ اسلام و تبلیغ اسلام کو بھی ترک کر دینے کا گویا اعلان کر دیا تھا، جو منصب رسالت کے بالکل منافی ہے۔

(نگار) آپ نے اپنے استفسار میں "سورۂ الکافرون" کا ذکر کیا ہے، جسے عوام سورۂ "قل یا" بھی کہتے ہیں۔ آپ کے پہلے اشتباہ کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت "قل یا ایہا الکافرون" کے بعد جن چار آیتوں میں اسلام و کفر کی تفریق ظاہر کی گئی ہے۔ ان میں یقیناً تکرار خیال پائی جاتی ہے۔ لیکن تکرار خیال کوئی عیب نہیں، بلکہ زور دینے کے لئے بہت سی باتیں مکرر کہی جاتی ہیں۔

آپ اس کا ترجمہ یوں کیجئے:-

"میں عبادت نہیں کرتا اس کی جس کو تم پوجتے ہو اور نہ تم اس کو اسکی پوجا کرتے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ (اور اے کافرو میں پھر اس بات کو دہراتا ہوں کہ) نہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں جسے تم پوجتے ہو اور تم اس کو پوجتے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔"

یہ عربی فن خطابت کا اصول ہے کہ جب کسی بات پر غیر معمولی زیادہ زور دینا مقصود ہوتا ہے تو ایک ہی فقرہ کو جوں کا توں یا بہ ادنیٰ تغیر پھر دہراتے ہیں۔ ہر زبان کے خاص اصول اظہار ہوتے ہیں اور ان کا مطالعہ انہیں اصول کے پیش نظر کرنا چاہئے۔ اور محض اپنی زبان کے طریق اظہار کو سامنے رکھ کر اس پر کوئی حکم لگانا نامناسب ہے۔

آپ کا دوسرا اشتباہ البتہ ذرا غور طلب ہے، کیونکہ "لکم دینکم ولی دین" کہہ دینے کے بعد وہ مفہوم بھی سمجھ میں آسکتا ہے جو آپ نے ظاہر کیا اور وہ خدشہ بھی دل میں پیدا ہو سکتا ہے جس کا اظہار آپ نے کیا۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔

قرآن کے ترجموں میں اگر لفظ دین کے معنی مسلک یا مذہب کئے گئے ہیں تو میرے خیال میں یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ عربی میں لفظ دین کے متعدد معانی

ہیں۔ اس کے ایک معنی حساب کے ہیں جیسے "مالک یوم الدین" جس کا ترجمہ "مالک روز حساب" کیا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا مفہوم عادت، سیرت، ملت، مسلک وجزا بھی ہے۔ اور تیسرا "گناہ ومعصیت بھی۔ کیونکہ یہ لفظ "لغت اضداد" میں شامل ہے، یعنی جس طرح طاعت کے مفہوم میں یہ لفظ مستعمل ہے اسی طرح معصیت کی جگہ بھی اس کا استعمال ہو سکتا ہے۔

اس لئے "لکم دینکم ولی دین" کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ ہماری طاعت وعبادت ہمارے ساتھ ہے اور تمہاری معصیت و گمراہی تمہارے ساتھ۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ہم کو اپنے اعمال کی جزا ملے گی اور تم کو اپنے اعمال کی سزا۔

یہ سورۃ ابتدا عہد نبوت میں نازل ہوئی تھی، جب رسول اللہؐ مکہ میں تشریف فرما تھے اور آپ نے تبلیغ اسلام شروع کر دی تھی، اس لئے یہ خیال قائم کرنا کہ آیات زیر بحث سے مایوسی یا ترک تبلیغ کا اظہار ہوتا ہے، درست نہیں، بلکہ اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہم تو خیر کبھی تمہارے مسلک پر نہیں آسکتے، لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر تم نے ہمارا مسلک اختیار نہ کیا اور اپنے کفر پر قائم رہے تو اس کی سزا بھی تمہیں ضرور ملے گی۔

(۳)

سب سے پہلی اور آخری آیات کلام اللہ

(مرزا حسین علی بیگ۔ جھنجھانہ)

چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں:

(۱) مجموعہ قرآن پاک میں سب سے پہلی آیت جو رسول اللہؐ پر نازل ہوئی کیا ہے اور سب سے آخری آیت کونسی۔

(۲) یہ تو معلوم ہے کہ قرآن مجید کے آیات اور اس کی سورتوں کی موجودہ ترتیب کوئی تاریخی ترتیب نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے اور موجودہ ترتیب کا ذمہ دار کون ہے۔ کیا اگر نزول وحی کے زمانہ کے لحاظ سے اسی طرح کلام مجید مرتب کر دیا جاتا تو اس میں کیا نقصان تھا۔

(نگار) (۱) منصب نبوت عطا ہونے سے قبل رسول اللہؐ کا معمول تھا کہ آپ غار حرا میں جا کر اکثر وبیشتر اپنی قوم کے اخلاقی انحطاط دور کرنے کی تدابیر پر غور فرمایا کرتے۔ آپ کا نکاح جناب خدیجہؓ سے ہو چکا تھا اور وہ بھی ۱۵ سال سے اس احساس میں آپ کی شریک تھیں۔ جب رسول اللہ کی عمر ۴۰ کے قریب پہونچی تو آپ کا یہ احساس بہت شدید ہو گیا اور ایک دن جب کہ آپ غار حرا میں اسی غور وفکر میں منہمک تھے کہ دفعتاً یہ آیتیں آپ کے ذہن میں القاء ہوئیں۔

اقرأ باسم ربک الذی خلق ـ خلق الانسان من علق ـ اقرأ وربک الاکرم ـ الذی علم بالقلم

مذہبی اصطلاح میں اسی القاء یا بے ساختہ قلبی آواز کا نام وحی ہے، اور مرموزی زبان میں اسی کو جبرئیل کہتے ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ سورۂ فاتحہ سب سے پہلے نازل ہوئی۔ بعض "یا ایہا المزمل قم اللیل الا قلیلا" کو بتاتے ہیں۔ لیکن قریب قریب سب کا اتفاق اسی پر ہے کہ اولین وحی وہی تھی جو اقرأ سے شروع ہوتی ہے۔

(۲) آخری وحی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب ۹ ذی الحجہ ۱۰ ہجری کو آپ حج سے فارغ ہوئے جسے حجۃ الوداع (یعنی آپ کی زندگی کا آخری حج) کہتے ہیں تو میدان عرفات میں یہ آیات نازل ہوئیں:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

ور پھر اس کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ کیونکہ حجۃ الوداع سے فارغ ہونے کے بعد آپ علیل ہوگئے اور تقریباً تین ماہ بعد ۱۲ ربیع الاول الھ کو آپ رحلت فرما گئے۔

دوران علالت میں آپ پر کوئی وحی نازل ہوئی یا نہیں اس کے بابت پورے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم کہا بھی جاتا ہے کہ یات مذکورۂ بالا کے بعد (جو حجۃ الوداع کے وقت نازل ہوئی تھیں) وحی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

(۳) قرآن کی موجودہ ترتیب یقیناً شانِ نزول کے لحاظ سے تاریخوار ترتیب نہیں، لیکن جو ترتیب اس وقت نظر آتی ہے وہ بلاشبہ رسول اللہؐ زندگی ہی میں ہو چکی تھی اور اسی کے پیش نظر بعد میں قرآنی نسخے مرتب ہوئے۔ یہ خیال کرنا کہ موجودہ ترتیب حضرت ابوبکر یا حضرت عثمان کے مانہ میں ہوئی ہے درست نہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ جمع قرآن کے وقت نزول وحی کے تاریخی سلسلہ کو کیوں نظرانداز کر دیا گیا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی ایک مسئلہ تمام آیات ایک ہی وقت نہیں، بلکہ مختلف اوقات میں نازل ہوئی تھیں۔ اور اگر انہیں اسی ترتیب سے رکھا جاتا تو سمجھنے و اخذ نتائج میں شواری ہوتی۔ اس لئے رسول اللہؐ نے ان میں یک گونہ تسلسل پیدا کر کے زیادہ قریب الفہم بنا دیا۔

وارثی منجن

یعنی

مسوڑھوں اور دانتوں کے جملہ امراض کے لئے اکسیر۔ پائیریا، درد، سوجن، دانت کا ہلنا۔ دانتوں سے پانی لگنا وغیرہ سب ایک ہفتہ کے استعمال سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتے ہیں۔ اسکے مسلسل استعمال سے عام صحت اور دانتوں کی خوشنمائی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ قیمت فی شیشی تین روپیہ۔ نمونہ کی شیشی ایک روپیہ علاوہ محصول

وارثی چورن

معاون ہضم، آنتوں کا مصلح، جگر کے فعل کو درست کرنے والا یعنی درد شکم، نفخ، قبض، بدہضمی متلی، الغرض جملہ شکایات معدہ و معاکا تیر بہدف علاج۔ قیمت فی شیشی تین روپیہ علاوہ محصولڈاک

نمونہ فی شیشی ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک۔

خاتون انڈسٹریل ہوم۔ دھرمسی واڑہ۔ کراچی نمبر ۲

منظومات

سید شفقت کاظمی:-

یاد آؤں کہ نہ آؤں میری قسمت لیکن　　ان سے امیدِ ملاقات چلی جاتی ہے
جب بھی آتا ہے تصور تیرے احسانوں کا　　ایک فریاد مرے منہ سے نکل جاتی ہے
خوش رہو دشتِ تمنا کی ہواؤ کہ مجھے　　تم سے بچھڑے ہوئے یاروں کی مہک آتی ہے

غور کرتا ہوں جو شفقت کبھی تنہائی میں
اپنے حالات پہ تا دیر ہنسی آتی ہے

منظر صدیقی اکبر آبادی:-

ہم سے آباد فضا، ذرے فروزاں ہم سے　　اب کہاں راہ نوردانِ بیاباں ہم سے
بجلیاں آج ہمارے ہی نشیمن پر گریں　　مانگنے آئی تھیں کل سوز کے ساماں ہم سے
عادت نالہ کشی عشق کی فطرت ٹھیری　　آپ کیا، سارا زمانہ ہے پریشاں ہم سے

آج کیا جلوہ گہہِ حسن کا شکوہ سننا
ہو چکے راکھ کئی سوختہ ساماں ہم سے

سعادت نظیر:-

جب سے مذاقِ بادہ کشی ہو گیا بلند
اک کیف سا ہے تلخیٔ کام و دہن کے ساتھ

"پرویز" کو نصیب کہاں یہ مقامِ عشق
ذکرِ وفا ہے "تذکرہ" "کوہکن" کے ساتھ

سرشار ہے وہ نشۂ صہبائے شوق ہیں
نسبت ہے جس کے دل کو تری انجمن کے ساتھ

ہر ایک بشر پہ مصیبت کا دور گزرا ہے
مگر زمانہ کسی کا بھی نوحہ خواں نہ ہوا

وہی مقام تو حاصل ہے قصۂ غم کا
کسی کی خاطرِ نازک پہ جو گراں نہ ہوا

کبھی خیال تمھارا، کبھی تمھارا غم
کوئی بھی لمحہ محبت میں رائیگاں نہ ہوا

نظیرؔ، نطقِ بشر کیا، نظر بھی عاجز ہے
سنو! یہ سچ ہے، کوئی دل کا ترجماں نہ ہوا

تابش شجاع آبادی:-

طوفان کی روداد نہ پوچھو کہ کیا ہوا
ساحل بھی بہہ گیا وہ تموّج بپا ہوا

بے ربطیٔ نقوش قدم کہہ رہی ہے صاف
نکلا ہے میکدے سے کوئی جھومتا ہوا

مایوس زندگی سے ہوں تابشؔ میں اس قدر
نغمہ بھی میرے حق میں نوید فنا ہوا

نگارِ پاکستان کے خاص نمبر

اقبال نمبر جس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتدا اور مختلف ادوار شاعری، اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاق و تصوف۔ اس کا آہنگ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت تین روپے

نظیر نمبر جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک، اس کا فارسی تغزل ادبیات اردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ اس کے امتیازات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، صنائع و طبائع شعراء کا فرق، معاصرین کی رائیں۔ مستند ادبا کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اس کی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قیمت تین روپے

مصحفی نمبر جس میں اردو ادب کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق، ان کی ابتدائی تعلیم ان کی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقا ان کی تالیف و تصانیف، انکی غزل گوئی و مثنوی نگاری، ان کے معاصر شعراء و ادبا، اور ان کے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت تین روپے

ہندی شاعری نمبر جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔ قیمت چار روپے

نیاز نمبر جس میں تقریباً پاک و ہند کے سارے ممتاز اہل قلم اور اکابر ادب نے حصہ لیا ہے۔ اس میں نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو مثلاً ان کی افسانہ نگاری، تنقید اسلوب نگارش، انشا پردازی، مکتوب نگاری۔ دینی رجحانات، صحافی زندگی، شاعرانہ زندگی، ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ گویا یہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت اور فن کا ایسا مرقع ہے جو اس سلسلے میں ایک مستند دستاویز اور اردو صحافت میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ صفحات ۶۲۴۔ قیمت آٹھ روپے

خدا نمبر خدا کا تصور کب اور کیسے پیدا ہوا؟ مختلف مذاہب میں اس تصور نے کس طرح جنم لیا؟ اس کی ارتقائی صورتوں نے تمدن انسانی پر کیا اثر ڈالا؟ بندے اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ اس تعلق کی تعبیر کس کس انداز میں کی گئی ہے۔ انبیاء کرام، مصلحین اور مجددین کے ارشادات اس کے متعلق کیا ہیں۔ ان ارشادات کو اقوام عالم نے کس طرح اپنایا ہے۔ اسلام کا موقف اس باب میں کیا رہا ہے۔ قیمت چار روپے

مینجر نگار پاکستان۔ ۳۲۔ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

غیر ضروری اور فاضل اخراجات کو روک کر بچائی ہوئی رقم

اسٹینڈرڈ بنک لمیٹڈ

میں جمع کیجئے

ایک سیونگز بنک اکاونٹ صرف پانچ روپے سے بھی کھلوا سکتے اور
اعلیٰ درجہ کی بنکاری خدمات سے پوری طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔

آج ھی آپ

ہماری کسی بھی شاخ میں اپنا اکاؤنٹ کھولئے اور
ھماری معیاری خدماتے سے فائدے اٹھائیے۔

یاد رکھئے 'اسٹینڈرڈ' اعلیٰ معیار خدمت کا نام ہے

ہیڈ آفس
محمدی ہاؤس۔ کراچی

اے میکلین
جنرل منیجر

۲۷۶۷۹
درآمد

S.B.L. 1964/11 یکتا

انٹرنیشنل پریس - کراچی